تختۂ مشق

کاشف زبیر

دورانِ سفر نئے نئے منظر اُبھرتے ہیں... فطری مناظر کے آئینے میں جہاں ہم کائنات کے رنگا رنگ نمونوں سے آگہی حاصل کرتے ہیں... وہاں زندگی کے اسرار اور حقائق سے بھی پردہ اٹھتا چلا جاتا ہے... ان منظروں کے ساتھ کبھی تو ماضی کی یادیں جڑی نظر آتی ہیں...اور کبھی عصری زندگی کے حوالوں کو سامنے لاتے ہیں... یہ ایک اَن دیکھی اور طلسماتی دنیا محسوس ہوتی ہے... اردگرد پھیلا ماحول اپنے اندر بہت سے اسرار اور بھید لیے نظر آتا ہے... شامی اور تیمور کی ہمراہی میں شروع ہونے والا ایک یادگار سفر... جہاں قدم قدم پر پاتالیں اور چٹانیں تھیں کہ اچانک ہی ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم ہوگیا... سنسنی خیز لمحات اور مہمات سے بھرپور شاہکار...

سرورق کی دوسری کہانی

تختۂ مشق

کاشف زبیر

دورانِ سفر نئے نئے منظر اُبھرتے ہیں... فطری مناظر کے آئینے میں جہاں ہم کائنات کے رنگا رنگ نمونوں سے آگہی حاصل کرتے ہیں... وہاں زندگی کے اسرار اور حقائق سے بھی پردہ اٹھتا چلا جاتا ہے... ان منظروں کے ساتھ کبھی تو ماضی کی یادیں جڑی نظر آتی ہیں... اور کبھی عصری زندگی کے حوالوں کو سامنے لاتے ہیں... یہ ایک اَن دیکھی اور طلسماتی دنیا محسوس ہوتی ہے... اردگرد پھیلا ماحول اپنے اندر بہت سے اسرار اور بھیدلیے نظر آتا ہے... شامی اور تیمور کی ہمراہی میں شروع ہونے والا ایک یادگار سفر... جہاں قدم قدم پر پاتالیں اور چٹانیں تھیں کہ اچانک ہی ہر طرف کشت وخون کا بازار گرم ہوگیا... سنسنی خیز لمحات اور مہمات سے بھرپور شاہکار...

ارضِ پاک سے جڑے محبتوں اور چاہتوں کے رشتوں سے منسلک تیز رفتار سرورق کے نشیب وفراز

شامی کا موڈ سخت خراب تھا اور اس خرابی کی وجہ گاڑی میں پیچھے بیٹھی تھی۔ اس کے برابر میں تیمور تھا جبکہ جوجی نوشی کے ساتھ تھا اور دونوں سر جوڑے سرگوشی میں محوِ گفتگو تھے۔ تیمور لینڈ کروزر چلا رہا تھا جبکہ فولاد خان نواب صاحب کی مرسیڈیز ڈرائیو کر رہا تھا اور یہ قافلہ ایک ہل اسٹیشن کی طرف رواں دواں تھا۔ پروگرام شامی نے بنایا تھا اور تیمور و جوجی اس کا ایک حصہ تھے۔ شامی نے سوچا تھا کہ اس بار وہ گرمیوں میں ان ہل اسٹیشنوں کا رخ نہیں کریں گے جہاں وہ کئی بار جا چکے تھے اور بہ قول شامی وہ جگہیں اسے حفظ ہوگئی تھیں اور وہ آنکھ بند کر کے بھی وہاں گھوم سکتا تھا۔ اس پر تیمور نے لقمہ دیا۔ ”اور پھر تیری آنکھ کسی اسپتال کے ہڈی وارڈ میں کھلتی۔“

”منہ سے بدفالیں مت نکال۔“ شامی نے ایک غیر ملکی ہائکر میگزین لہراتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو ذرا، جگہیں ہماری ہیں اور ہمیں بتاتے یہ گورے ہیں۔“

تیمور بھی دیکھ کر حیران ہوا۔ رسالے میں شمالی علاقے کے ایک نیچرل

پارک کے ساتھ بننے والے اس ہل اسٹیشن ریسورٹس کی تصویریں اور سہولیات کا ذکر تھا۔ یہاں سے کئی معروف ٹریکس اور ہائکنگ سائٹ شروع ہوتے تھے۔ یہ ریسورٹس چند سال پہلے معروف ہوا تھا اور اب وہاں دارالحکومت میں موجود غیر ملکی گرمی سے بچنے کے لیے جاتے ہیں۔ ان میں خاصی بڑی تعداد خواتین کی ہوتی ہے۔ تیمور نے اس کا ارادہ سنتے ہی کہہ دیا کہ شامی انہی خواتین کے چکر میں وہاں جا رہا ہے۔ شامی نے تردید کی۔ ”نہیں یار! وہاں دیکھنے کو اور بھی بہت کچھ ہے اور پھر اس گرمی سے تو نجات ملے گی۔ ویسے آپس کی بات ہے فطرت کا حسن خواتین کے بغیر ادھورا سا لگتا ہے۔“

مگر تیمور فی الحال صرف گرمی کے معاملے میں شامی سے متفق تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے ایسی گرمی پڑی تھی کہ وہ لڑکیوں کو بھی بھول گئے تھے۔ شامی کا کہنا تھا کہ اسے زندگی میں پہلی بار صنفِ نازک سے الجھن محسوس ہوئی تھی۔ کیونکہ ان کے قریب جانے سے بھی گرمی لگتی ہے۔ تیمور نے میگزین میں اس ریسورٹس کا جو احوال پڑھا اور اس کی تصویریں دیکھی تھیں تو وہ فوراً وہاں جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ برف پوش پہاڑوں کی قربت میں یہاں یا تو گھنے جنگل تھے یا بہتے اور شور مچاتے چشمے۔ نیچرل پارک ہونے کی وجہ سے آبادی بہت کم تھی اور سیاحوں کے لیے چند اعلیٰ درجے کے ہوٹل تھے۔ چونکہ یہاں شاپنگ کا کوئی بندوبست نہیں تھا اس لیے مقامی خواتین یہاں کا رخ کرنے سے گریز کرتی تھیں اور صرف غیر ملکی خواتین آتی تھیں جن کے اپنے ملک میں اس قسم کے مناظر کم دیکھنے کو ملتے تھے۔ اسی طرح بعض مقامی ٹریکنگ اور ہائکنگ کے شوقین بھی اس طرف کا رخ کرتے تھے۔ شامی کے خیال میں غیر ملکیوں اور خاص طور سے خواتین کی ریل پیل میں چند مقامیوں کو برداشت کیا جا سکتا تھا۔ تیمور نے اسے یاد دلایا کہ وہ خود بھی مقامی تھے۔

میگزین کی تصاویر میں فطری مناظر سے زیادہ ان غیر ملکی خواتین کی تصاویر تھیں جن کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ان کو ان برف پوش پہاڑوں کی قربت میں بھی گرمی لگ رہی ہے اور اس کا اظہار وہ کم لباسی سے کر رہی تھیں۔ شامی کے بارے میں رائے دینے کے بعد تیمور نے تصاویر دیکھ کر اتفاق کیا کہ شامی حق بہ جانب تھا۔ یہ خواتین اس قابل تھیں کہ انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کی خاطر وہ ان کے ملک چلے جاتے۔ وہ تو پھر بھی یہاں دستیاب ہو رہی تھیں۔ تیمور نے اس موقع پر شامی کی موقع شناسی کی صلاحیت کی داد بھی دی۔ تیمور کا ایم بی اے کا آخری سیمسٹر ختم ہو گیا تھا اور شامی پہلے ہی بی ای سے فارغ تھا۔ اس نے نواب صاحب کے استفسار پر ماسٹر کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور اس سے پہلے وہ ایک دو سال کا وقفہ دینا چاہتا تھا۔ اس پر نواب صاحب نے فرمایا۔

”برخوردار! اگر آپ اسی طرح آرام سے تعلیمی مدارج مناسب وقفوں سے طے کرتے رہے تو امکان ہے پی ایچ ڈی کرتے کرتے آپ ریٹائرمنٹ کی عمر تک پہنچ جائیں گے۔“

شامی نواب صاحب کے اس اندیشے سے خوش ہوا تھا کیونکہ نوکری کے خیال سے اسے ویسے ہی ہول آتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے نوکری کی کیا ضرورت ہے۔ جدی پشتی اتنی دولت تھی کہ ان کی سات نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی تھیں۔ بہرحال ذکر ہو رہا تھا ہل اسٹیشن کا۔ شامی اور تیمور نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ جوجی کے بارے میں طے پایا کہ اسے بالکل آخری موقع پر بتایا جائے گا کیونکہ ان دنوں اس کے اور نوشی کے تعلقات میں بہت بڑا یوٹرن آیا تھا اور اب ان دونوں میں گاڑھی چھن رہی تھی۔ نوشی باضابطہ جوجی کی بگ سسٹر بن گئی تھی۔ جوجی کا کہنا تھا اب وہ نوشی کے بغیر جہنم بھی نہیں جائے گا۔ شامی کو یقین تھا کہ اس یوٹرن کے پیچھے نوشی خود تھی۔ جوجی کو برادرِ خرد بنانے کا مقصد شامی کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا تھا۔ شامی جوجی کو باز نہیں رکھ سکا تھا۔

”یار اسے چھوڑو۔“ تیمور نے مشورہ دیا۔ ”تم نے روانگی سے ایک منٹ پہلے بھی بتایا تو ضرور اپنی آپا کو اطلاع کرے گا اور اس کے پاس بی ایم ڈبلیو ہے۔ وہ دوڑاتی ہوئی آجائے گی۔“

شامی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں یار! اب جوجی کے بغیر مزہ نہیں آتا ہے۔“

تیمور نے شانے اچکائے۔ ”تمہاری مرضی... بعد میں خود بھگتو گے۔“

مگر بدقسمتی نوشی نہیں بلکہ نواب صاحب کی صورت میں آئی۔ شامی اور تیمور نے ان سے اجازت طلب کی اور یہ طلبی ان کے گلے پڑ گئی۔ نواب صاحب ایک نئے ہل اسٹیشن کا سن کر چونکے اور جب انہوں نے میگزین میں تصاویر دیکھیں تو وہ بھی جانے پر آمادہ ہو گئے۔ یہاں تک تو پھر بھی گوارا تھا۔ شامی اور تیمور کو امید تھی کہ دادا جان زیادہ وقت ہوٹل میں یا اس کے ٹیرس پر گزاریں گے کیونکہ ان کی عمر اب ان راستوں پر ہائکنگ کی نہیں رہی تھی۔ اس سفر میں ہائکنگ کا پروگرام بھی شامل تھا۔ مگر اسی رات نوشی بن بلائے مہمان

کی طرح آئی اور نواب صاحب کے اصرار پر ڈنر میں شامل ہوئی تو کچھ دیر بعد وہی ہوا جس کا شامی کو خطرہ تھا۔ یعنی نواب صاحب نے نوشی کو اس پروگرام سے آگاہ فرما دیا اور اس نے معنی خیز انداز میں شامی کا چہرہ دیکھا جس پر بارہ بج گئے تھے اور اسی وقت پروگرام میں اپنی شمولیت کا اعلان کر دیا۔ شامی کی بھوک مر گئی اور خود اس کا بھی فوت ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔

ڈنر کے بعد وہ یوں کمرے میں ٹہل رہا تھا جیسے اس نے ڈبل کھا لیا ہو اور اب اسے ہضم کرنا چاہ رہا ہو۔ تیمور راکنگ چیئر پر جھول رہا تھا۔ شامی نے اس سے ایک درجن ویں بار کہا۔ ”تیمور کچھ کر۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں؟“ تیمور نے مزے سے کہا۔ ”نہ میں دادا حضور کو سمجھا سکتا ہوں اور نہ تو نوشی کو۔“

”میں خودکشی کر لوں گا۔“ شامی نے احتیاط سے اپنے بال نوچے کیونکہ ایک ہفتہ پہلے اس نے یہ ہیئر اسٹائل بنایا تھا اور اسے دیکھ کر نواب صاحب نے فرمایا تھا کہ اسے ہیئر کٹ کی اشد ضرورت ہے۔

”پرانے وقتوں میں شرفا ایسا ہی کرتے تھے۔ میرا مطلب ہے بات بات پر خودکشی۔“ تیمور نے سر ہلایا۔ ”لیکن دوست اب یہ آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے۔ بندہ قتل ہو تو دشمن پکڑے جاتے ہیں لیکن خودکشی کرلے تو پولیس پہلے لواحقین کو لے جاتی ہے۔“

”پولیس کی خیر ہے مگر خودکشی کرنے والے کو فرشتے ڈائریکٹ جہنم میں لے جاتے ہیں۔“ شامی نے کہا۔ ان دنوں وہ ایک چینل سے آنے والے مذہبی پروگرام باقاعدگی سے دیکھ رہا تھا اور اس کی دینی معلومات میں خاصا اضافہ ہوا تھا جس کا وہ وقتاً فوقتاً اظہار بھی کرتا رہتا تھا۔ اگرچہ لڑکیوں کے بارے میں اس کے خیالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔

”تب صبر کر۔“ تیمور نے مشورہ دیا۔ ”اللہ صبر کرنے والوں کو صبرِ جمیل بھی عطا کرتا ہے، خوب تر کر کے۔“

”یہ بھی صبر کی ایک قسم ہے۔ صنفِ نازک کی نہیں۔“ شامی نے تصحیح کی۔

”اچھا۔“ تیمور مایوسی سے بولا۔ ”میں تو سمجھتا تھا کہ ایک بیوی یا گرل فرینڈ ہاتھ سے نکل جائے اور بندہ صبر کرے تو اس کا متبادل ملتا ہے۔“

کیونکہ نوشی کو پہلے ہی علم ہو گیا تھا اس لیے اب جوجی کو بتا دینے میں کوئی حرج نہیں تھا مگر اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ”نوشی باجی جائیں گی؟“

”کیوں نہیں۔“ شامی غرایا۔ ”تمہاری آپا جان پیچھا چھوڑنے والی چیز ہے۔“

جوجی ہنسا۔ ”ہاں وہ کہہ رہی تھیں کہ جہنم تک آپ کا پیچھا کریں گی اور جب آپ اندر جائیں گے تو وہ دروازے سے پلٹ آئیں گی۔“

”نہیں، وہ مجھے دھکا دے کر آئے گی۔“ شامی نے بھنا کر کہا۔

اس مرحلے پر سب سے خوش باش تیمور اور فولاد خان تھے۔ فولاد خان کو اس گرمی میں گیٹ پر بیٹھنا پڑتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اس کا مغز فرائی ہو جاتا تھا۔ اس نے شامی اور تیمور سے کہا۔ ”کابی کابی ام کو فرائی مغز کا بو بی آتا اے۔“

شامی کا خیال تھا کہ بو اصل میں بھوسا جلنے کی آتی ہو گی مگر اس نے خیال کے اظہار سے گریز کیا کیونکہ بدقسمتی سے وہ گزشتہ تین مہینے سے فولاد خان سے لیے قرض پر سود ادا نہیں کر پا رہا تھا اور فولاد خان فراخ دلی سے اسے چھوٹ دے رہا تھا مگر وہ سود پر سود لگانا نہیں بھول رہا تھا۔ بہرحال یہ رعایت بھی کم نہیں تھی اس لیے شامی اس کی خوشنودی کا خصوصی خیال رکھ رہا تھا۔ تیمور اس لیے خوش تھا کہ نواب صاحب کے ساتھ ہونے کے بعد وہ اخراجات کی فکر سے آزاد ہو جائیں گے۔ نواب صاحب نے پہلے ہی ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں کمرے بک کرا لیے تھے۔ یہ ایک ہفتے کا پروگرام تھا۔ وہ ایک اتوار کی صبح روانہ ہوتے اور دوسرے اتوار کو واپسی ہوتی۔ روانگی سے پہلے شامی نے چپکے سے تیمور سے کہا۔ ”ہم دونوں واپسی سے دو دن پہلے ٹریک پر نکل جائیں گے اور جب واپس آئیں گے تب تک دادا جان اور نوشی جا چکے ہوں گے۔“

”یہ پروگرام میں شامل نہیں ہے۔“ تیمور نے اسے یاد دلایا۔

”شامل کیا تو جا سکتا ہے۔“ شامی نے اصرار کیا۔

”اگر نوشی ساتھ گئی تو؟“ تیمور منفی امکانات پر زیادہ غور کر رہا تھا۔

”اب وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ ہم راستے کی مشکلات کا کہہ کر انکار کر دیں گے اور اسے بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“

”اس صورت میں جوجی کو چھوڑ کر جانا ہو گا۔“

شامی نے تیمور کو راضی کر لیا۔ نوشی سے بچنے کے لیے وہ جوجی کو بھی چھوڑ کر جانے کے لیے تیار تھا۔ سفر تقریباً

سات آٹھ گھنٹے کا تھا اس لیے وہ لنچ کا بندوبست کر کے نکلے۔ روانگی صبح سات بجے ہوئی۔ اس وقت بھی سورج نکلتے ہی آگ برسانے میں لگ گیا تھا۔ اس لیے سب خوش تھے کہ آج شام تک وہ اس گرمی سے دور جا چکے ہوں گے سوائے شامی کے۔ ایک گھنٹے بعد وہ پہاڑوں میں داخل ہو چکے تھے اس لیے شامی نے اے سی آف کر کے کھڑکیاں کھول دیں۔ وہ خنک اور خوشبودار ہوا سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اچانک نوشی نے کہا۔ ''جب ہم اتنی دور جا رہے ہیں تو ٹریک بھی رکھ لیتے ہیں۔''

شامی اچھلا اور گاڑی لہرائی۔ مگر اس نے فوراً قابو کر لی اور جلدی سے بولا۔ ''ٹریک کی کیا ضرورت ہے؟''

''کیا فائدہ؟ بس ہوٹل میں جا کر رکو اور بس آس پاس دیکھ کر آ جاؤ۔'' نوشی بولی۔ ''میں نے تو سوچ لیا ہے ٹریک پر جانے کا... اور کون کون ساتھ جائے گا؟''

''کوئی نہیں۔'' شامی نے جل کر کہا۔

''میں تم سے پوچھ بھی نہیں رہی ہوں۔'' نوشی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جوجی نے اس کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔

''میں جاؤں گا باجی کے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے جب راستے میں کوئی ریچھ حملہ کرے گا تو تم نوشی کی حفاظت کرنا۔'' شامی نے مشورہ دیا۔

''ریچھ۔'' جوجی فکر مند ہو گیا۔ ''راستے میں ریچھ ہوں گے؟''

''سنا ہے، ریچھ خوب صورت لڑکیوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ تم لوگوں کے لیے مسئلہ یہ نہیں ہو گا مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ راستے میں کوئی بدذوق ریچھ نہ مل جائے۔''

''اس کے لیے اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔'' نوشی نے جواب دیا۔ ''وہ تو شہر میں بھی مل جاتے ہیں۔''

شامی نے کھسیاہٹ ظاہر نہیں کی اور پھر وہ گاڑی روکنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ سامنے گاڑیوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ اس نے گاڑی ایک طرف روکی لیکن اس طرح کہ ریورس کرنا پڑے تو کوئی مشکل نہ ہو۔ ایسا لگ رہا تھا آگے سلائڈنگ ہوئی تھی۔ نواب صاحب کی مرسیڈیز پیچھے تھی۔ تیمور نے کھڑکی سے جھانکا اور اطلاع دی۔ ''لینڈ سلائڈنگ ہوئی ہے۔''

''اس سفر میں بس اسی کی کسر رہ گئی تھی۔'' شامی نے ٹھنڈی سانس لی۔

اس دوران میں فولاد خان اتر کر آیا۔ ''نواب صیب فرماتا اے کہ واپس چلو۔''

''واپس کہاں؟''

''اور کوئی راستہ اے، نواب صیب جانتا اے۔''

''جلدی کرو۔'' تیمور نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ پبلک واپسی کا راستہ بھی بند کر دے اور ہم بیچ میں پھنس کر رہ جائیں۔''

شامی نے عجلت میں گاڑی موڑی۔ اس تنگ جگہ پر یہ خاصا مشکل کام تھا مگر اس نے کسی طرح کر ہی لیا۔ چند مہینے پہلے وہ برف باری دیکھنے گئے تھے اور اسی طرح کے ایک ٹریفک جام میں پھنس گئے تھے۔ انہیں پورے دو دن سخت سردی میں وہیں گزارنے پڑے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے توبہ کر لی تھی کہ ایسی جگہوں سے دور رہیں گے جہاں ٹریفک جام کا احتمال بھی ہو۔ بہرحال نواب صاحب کے بروقت فیصلے نے انہیں بچا لیا۔ اگر وہ اتر کر معلومات حاصل کرنے میں لگ جاتے تو تب تک پیچھے گاڑیوں کی ایک ناقابلِ واپسی لائن لگ چکی ہوتی اور وہ پھر شاید ایک دو دن گاڑی میں ہی گزارتے۔ محفوظ حد تک پیچھے آنے کے بعد نواب صاحب کی گاڑی رک گئی۔ شامی اور تیمور اتر کر ان کے پاس آئے۔ نواب صاحب کے پاس اس پورے علاقے کا نہایت تفصیلی نقشہ تھا اور وہ اسی کا معائنہ فرما رہے تھے۔ انہوں نے ایک باریک سی لکیر پر انگلی رکھی۔

''یہ راستہ ہے۔''

تیمور نے غور کیا۔ ''یہ تقریباً دوگنا ہے اور ہمیں مظفر آباد کے اوپر سے بھی گزرنا پڑے گا۔''

''تاخیر سے سہی لیکن ہم آج ہی پہنچ سکتے ہیں۔'' نواب صاحب نے کہا۔ ''اب روانگی اختیار کی جائے۔''

''تعمیل ہو گی عالی جاہ۔'' شامی اور تیمور دونوں بیک وقت کورنش بجا لائے اور پھر اپنی گاڑی کی طرف بھاگے۔ نواب صاحب نے پہلے انہیں گھورا اور پھر مسکرا دیے۔ ان کے اشارے پر فولاد خان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس راستے پر مڑتے ہی ہائی وے اور عام سڑک کا فرق سمجھ میں آ گیا تھا اگرچہ یہ مرسیڈیز تھی اور اس کا سسپنشن سسٹم بہترین حالت میں تھا، اس کے باوجود جھٹکے لگ رہے تھے۔ سڑک گڑھوں اور ابھاروں سے بھری ہوئی تھی۔ بعض اوقات تو چاروں ٹائر الگ الگ سطحوں پر ہوتے تھے۔ اچانک نواب صاحب نے فولاد خان سے پوچھا۔ ''تمہارا پستول کہاں ہے؟''

''امارا بیلٹ کے سات اے نواب صیب۔'' اس نے

جواب دیا۔ ''کوئی خطرا اے تو ام تیار رئے گا۔''

''ہم عام راستے سے ہٹ گئے ہیں اس لیے کسی بھی صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

راستہ نہ صرف طویل بلکہ بہت خراب بھی تھا۔ وہ بارہ بجے اس پر مڑے تھے اور تین بجے تک نصف راستہ بھی طے نہیں ہوا تھا۔ اس اچھلتے کودتے سفر نے سب کے معدوں کو ہیبز دی تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ لنچ کے لیے رک گئے۔ البتہ نواب صاحب نے خبردار کر دیا کہ صرف بیس منٹ کا وقفہ ہے اور اس کے بعد لازمی روانہ ہونا ہے۔ صرف اسی صورت میں وہ رات سے پہلے ریسورٹس تک پہنچ سکتے تھے۔ اس لیے سب جلدی جلدی کھانے میں مصروف تھے۔ اس وقت وہ مظفر آباد سے کہیں اوپر تھے۔ یہ ویران اور سنسان نظر آنے والا علاقہ تھا۔ یہاں سڑک کے دونوں طرف گھنا جنگل تھا اور اس میں راستے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ یعنی یہاں عام افراد کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ سڑک پر درختوں سے گرے سوکھے پتوں کا ڈھیر تھا اور یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ یہاں گاڑیوں کی آمد بھی کم ہوتی تھی۔ یہ جگہ سطح سمندر سے خاصی بلند تھی کیونکہ موسم گرما میں بھی یہاں سردی لگ رہی تھی۔ رات تو یقیناً بہت سرد ہو جاتی ہو گی۔ کہیں کہیں سے دور برف پوش پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ لنچ سے فارغ ہو کر وہ روانہ ہوئے اور ابھی مشکل سے سو گز آگے گئے ہوں گے کہ سڑک کی پہاڑ والی سمت سے ایک شخص لڑکھڑاتا ہوا آ کر نواب صاحب کی گاڑی کے آگے گرا۔ فولاد خان نے پھرتی سے بریک لگائے اور بے ساختہ بولا۔ ''خدائی خوار مرے گا کیا؟''

☆☆☆

انگریزوں کے زمانے میں یہ عمارت ریسٹ ہاؤس ہوا کرتی تھی جس میں اعلیٰ حکام ٹھہرتے تھے۔ مگر آزادی کے بعد یہ بیکار ہو گئی۔ حکام نے یہاں آنا چھوڑ دیا پھر عملہ بھی واپس بلا لیا گیا اور تب سے یہ عمارت ویران پڑی تھی۔ مضبوط پتھروں سے بنی اس عمارت پر کھپریل کی چھت تھی۔ تقریباً ایک کنال رقبے پر محیط اس عمارت میں کئی بڑے کمرے اور ہال تھے۔ اس کے چاروں طرف کسی زمانے میں بڑا سا باغ ہوتا تھا مگر اب وہاں گھنا جنگل اگ آیا تھا جو اس عمارت کو چھپا رہا تھا۔ نصف صدی تک ویران رہنے کے بعد چند سال پہلے یہ عمارت غیر آباد نہیں رہی تھی۔ یہاں پراسرار افراد کی آمدورفت شروع ہوئی اور پھر انہوں نے یہاں باقاعدہ قبضہ کر لیا۔ بہت خاموشی سے یہاں سامان لایا جاتا اور عمارت کے اندرونی حصے میں تبدیلیاں ہوئیں۔ وہ بالکل بدل کر رہ گئی لیکن اس کا ظاہری روپ ویسا ہی رہا۔ اسے بالکل نہیں چھیڑا گیا تھا۔ حد یہ کہ عمارت میں آمدورفت کے لیے ایک الگ سے سرنگ نما راستہ بنایا گیا اور اسے خفیہ رکھا گیا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے اندر اور تہ خانے کا اسٹرکچر توڑ کر اس میں نہایت جدید قسم کے کمرے بنائے گئے تھے۔ تہ خانہ صرف اس خفیہ پروجیکٹ کے لیے مخصوص تھا جس کے لیے یہ لوگ یہاں آئے تھے اور وہاں ہر کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ البتہ اوپری عمارت میں کام اور رہائش کے لیے کمرے بنائے گئے تھے۔ ایسے ہی ایک کمرے میں جوناتھن ایڈ موجود تھا۔ اس نے ڈاکٹروں جیسا لباس پہن رکھا تھا اور چھوٹے سے گلاس میں موجود وسکی کے گھونٹ لیتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھا۔ تین سال پہلے وہ ڈپلومیٹک پاسپورٹ پر یہاں آیا تھا۔ اس کے بعد وہ سلپ ہو گیا۔ لیکن ان تین سالوں میں وہ دوبار اپنے وطن گیا اور آیا تھا۔ اس کی یہ آمدورفت پاکستان کے پڑوسی ملک میں قائم ایک فوجی ہوائی اڈے سے ہوئی تھی۔

اس کا اصل نام کچھ اور تھا لیکن وہ جوناتھن ایڈ نام کے پاسپورٹ پر یہاں آیا تھا۔ چند سال پہلے اس نے مائکرو بائیولوجی میں اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور ایک کمپنی میں ملازمت کرنے لگا۔ مگر دورانِ ملازمت اس سے ایک سنگین غلطی ہوئی۔ اس نے ایک مہنگے پروجیکٹ کے آخری مرحلے میں پروسیس غلط کر دیا اور کروڑوں ڈالرز مالیت کا پروجیکٹ ضائع گیا۔ اسے پھر سے شروع کرنا تھا اور کمپنی نے شروع کیا بھی لیکن پہلے اس نے جوناتھن کو ملازمت سے فارغ کیا۔ عملاً اسے دھکے دے کر دفتر سے نکالا گیا تھا اور ظاہر ہے اس کے بعد اسے کہیں اور ملازمت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ چھوٹی موٹی ملازمتیں کر کے گزارہ کرنے لگا۔ چند سالوں میں اس کے ہوش ٹھکانے لگ گئے۔ اس کی ساری جمع پونجی ٹھکانے لگ گئی تھی اور وہ ایک بدحال سے کمرے میں رہتا تھا۔

وہ ایک کارخانے میں چوکیدار کی ملازمت کر رہا تھا اور اسے لگتا تھا کہ اس نے اعلیٰ تعلیم کا خواب دیکھا تھا۔ اب اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ انہی دنوں ایک پراسرار سا شخص اس سے ملا۔ جوناتھن ملازمت کے بعد خاصا وقت ایک گھٹیا سے بار میں گزارتا تھا۔ اس پراسرار شخص سے وہیں ملاقات ہوئی اور پھر دوسری ملاقات میں اس نے جوناتھن کو کام کی

پیشکش کی۔ اس نے بتایا کہ تین سال کا پروجیکٹ ہوگا اور کام بھی اس کی ڈگری کی مناسبت سے ہوگا۔ اس دوران میں اسے نہایت پُرکشش معاوضہ دیا جائے گا اور کام مکمل ہونے پر اسپیشل بونس الگ ملے گا۔ معاوضہ اور خصوصی بونس کی رقم کا سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ کام کی نوعیت جانے بغیر اسے کرنے کو تیار ہو گیا۔ تب اس کی دوسری شناخت بنائی گئی اور اس کے تحت اس کا پاسپورٹ اور دوسری دستاویزات بنیں۔ وہ بہ ظاہر سفارتی عملے میں شامل ہو کر یہاں آیا تھا۔

مگر اس سرزمین پر اترتے ہی اس کی تمام دستاویزات ضائع کر دی گئیں۔ پھر اسے اس عمارت تک پہنچایا گیا۔ پروجیکٹ کے بارے میں بھی اسے یہیں پہنچ کر علم ہوا مگر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ ایک سال کی تنخواہ وہ پیشگی وصول کر چکا تھا۔ دوسرے اسے معلوم تھا کہ اس سے کوئی غیر قانونی اور غیر انسانی کام ہی لیا جائے گا۔ وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا۔ جوناتھن نے چند سالوں میں جس طرح کی زندگی گزاری تھی، وہ دولت اور پُرآسائش زندگی کے لیے شیطان کا چیلا بننے کے لیے بھی تیار تھا۔ اس نے آتے ہی پروجیکٹ پر کام شروع کر دیا اور اس کا کام تقریباً مکمل ہو گیا تھا مگر آج صبح ایک مسئلہ ہوا۔ اسے بتایا گیا کہ چیمبر فائیو کا آدمی نہ جانے کس طرح وہاں سے نکل گیا تھا، یہی نہیں وہ عمارت سے بھی غائب تھا۔

جوناتھن یہاں کا انچارج تھا اور اسے نصف درجن تربیت یافتہ افراد دیے گئے تھے جو ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنا جانتے تھے۔ خاص پروجیکٹ کے لیے اس سمیت چھ افراد تھے اور یہ سب غیر ملکی تھے البتہ ان کا تعلق مختلف مغربی ممالک سے تھا۔ اسپیشل سروس کے افراد بھی مغربی ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا کام اس جگہ کی حفاظت کرنا اور یہاں کسی کو دخل اندازی کرنے سے روکنا تھا۔ اس جگہ کی خاص اور جدید ترین الیکٹرانک سیکیورٹی بھی تھی۔ معمولات اتنے منظم تھے کہ کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، ہر شخص اپنا کام جانتا تھا۔ ایک درجن غیر ملکیوں کے ساتھ یہاں صرف دو مقامی تھے۔ وہ پروجیکٹ اور اپنی شناخت کو خفیہ رکھنے کے معاملے میں بہت محتاط تھے۔ غیر ملکی بھی جب باہر جاتے تھے تو مقامی وضع قطع اور حلیہ بنا کر جاتے تھے۔

انہوں نے اپنی آمدورفت کے روٹس ایسے رکھے تھے جن میں عام لوگوں سے کم سے کم واسطہ پڑے۔ ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے چاروں طرف کیمرے لگائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ ایسے سینسرز تھے کہ اگر کوئی عمارت کے ایک خاص حد تک قریب آتا تو اندر الارم بج جاتا۔ عمارت کے درمیانی حصے اور اس کے نیچے موجود تہ خانے کو خاص طور سے دھات اور فائبرز کے ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا۔ یہ جگہ مکمل طور پر ائر ٹائٹ تھی اور فرار ہونے والا شخص یہیں سے نکلا تھا۔ سیکیورٹی انچارج کرنل سوین نے اس کی غیر موجودگی جانتے ہی ہنگامی حالت کا الارم بجا دیا تھا۔ جوناتھن کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ وہ اس جگہ سے نکلا کیسے؟ تین گارڈز اب اسے باہر تلاش کر رہے تھے۔ جوناتھن فکر مند تھا۔ اگر وہ آدمی نہ ملتا تو اس سے پوچھ گچھ ہوتی اور اس کا بھاگ نکلنا پروجیکٹ کے خاتمے کا سبب بھی بن سکتا تھا۔

وہ یہ بات چھپا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہاں ہونے والے کیمروں کی ریکارڈنگ باقاعدگی سے باہر بھیجی جاتی تھی اور اس سے وہ لوگ جان جاتے تھے کہ پروجیکٹ پر کس حد تک کام ہو رہا ہے اور کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی ہے۔ یہاں ان کے سونے کے کمروں تک میں کیمرے لگے ہوئے تھے۔ جوناتھن فکر مند ہو رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی اندر آئی۔ وہ مقامی اور کسی قدر موٹے نقوش کی حامل تھی لیکن اس میں نسوانی دلکشی کی کمی نہیں تھی۔ اپنی کسی قدر سفید رنگت کو اس نے میک اپ سے سرخ کیا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں عجیب وضع کے ٹاپس تھے۔ گول دھاتی ٹاپس پر بندر نما شبیہ کندہ تھی۔ ''رانتا۔'' جوناتھن نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''کچھ پتا چلا؟''

جوناتھن نے رانتا کو لگایا تھا کہ وہ باہر جانے والوں سے رابطے میں رہے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ریش، مائیکل اور کارل اس کے پیچھے ہیں۔ وہ بچ نہیں سکے گا۔ ویسے بھی وہ بس آخری وقت پر تھا۔''

جوناتھن نے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں شام کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اس نے سر ہلایا۔ ''اسے بس ختم سمجھو لیکن اس کا کسی کے سامنے آنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس سے وائرس کسی کو لگ سکتا ہے۔''

''ہاں، یہ خطرہ ہے۔'' رانتا فکر مند ہو گئی۔ اس کا تعلق پڑوسی ملک سے تھا۔ جوناتھن سے اس کی ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ وہ کال گرل تھی اور جوناتھن سے پہلی ملاقات اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔ لیکن جوناتھن اس سے اتنا خوش ہوا کہ اسے اس پروجیکٹ میں جاب دے کر ساتھ لے آیا۔ ایک طرح سے وہ مددگار تھی۔ تجربات کے لیے مقامی جوان وہی مہیا

کرتی تھی۔ وہ انہیں اپنے حسن کے جال میں پھنساتی اور پھر یہاں لے آتی تھی۔ مگر اس کا کام بہت کم تھا۔ مہینے میں شاید ایک دو بار ہی اسے کام کرنا ہوتا تھا اور باقی وقت وہ آرام کرتی تھی۔ یوں جوناتھن نے ایک طرح سے سرکاری خرچ پر محبوبہ رکھ لی تھی۔ رانتا یہاں کے معاملات سے خاصی حد تک واقف ہو گئی تھی اور بہ وقتِ ضرورت وہ کسی کی جگہ کام بھی کر سکتی تھی۔ اس لیے بھی جوناتھن کو فکر نہیں تھی کہ بات کھل گئی تو اسے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ وہ جس پروجیکٹ سے متعلق تھا، اس کی کوئی بات کھل ہی نہیں سکتی تھی۔ ہاں اگر اس کی غلطی سے پروجیکٹ ناکام ہوتا یا وہ پکڑے جاتے تو پھر اسے ہی ذمے دار سمجھا جاتا۔ اسی لمحے جوناتھن کے سامنے رکھے واکی ٹاکی سے بپ کی آواز آئی۔ اس نے واکی ٹاکی اٹھا کر بٹن دبایا۔

''یس؟''

دوسری طرف کرنل سوین تھا، اس نے کہا۔ ''ہم نے تلاش کر لیا ہے لیکن یہاں دو گاڑیوں میں کچھ لوگ بھی ہیں۔ مائیکل نے ان کی طرف ٹیسٹ شاٹ کیا ہے۔''

''جواب آیا؟''

''نہیں، عام لوگ لگ رہے ہیں۔''

''نمبر فائیو کہاں ہے؟''

''سڑک پر موجود ہے اور ساکت ہے۔'' دوسری طرف سے ریش نے کہا۔ ان سب کے واکی ٹاکی آپس میں منسلک تھے اور یہ خاصی دوری سے بھی کام کرتے تھے۔

''ان کا کیا کیا جائے؟''

جوناتھن نے سوچا اور بولا۔ ''سب کو ختم کر دو اور لاشیں جلا دو۔ کوئی خطرہ مول مت لینا۔ کام یقینی ہونا چاہیے۔''

''یس سر۔'' ریش نے جواب دیا۔

☆☆☆

پیچھے تیمور نے گاڑی روک دی۔ اب وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ سب ہی اتر آئے تھے لیکن ان سے پہلے نواب صاحب اتر آئے تھے اور اس شخص کے پاس پہنچ گئے تھے جو سڑک پر اوندھے منہ پڑا اہل رہا تھا۔ نواب صاحب اس کا معائنہ کر رہے تھے مگر انہوں نے اسے ہاتھ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تیمور اس کی طرف بڑھا تھا کہ نواب صاحب نے روک دیا۔ ''چھونا مت... یہ دیکھو۔''

آدمی مقامی تھا اور اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کی قمیص کا کالر جہاں سے ہٹا ہوا تھا، وہاں اس کی گردن اور منہ پر آبلے سے دکھائی دے رہے تھے اور یہ صرف آبلے نہیں تھے، بہت تیزی سے بڑھتے ہوئے زخم تھے۔ اچانک وہ تڑپ کر سیدھا ہوا تو اس کا چہرہ دیکھ کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کا چہرہ چھوٹے چھوٹے آبلوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں کی جگہ تاریک گڑھے تھے۔ ان گڑھوں سے گندی سی رطوبت خارج ہو رہی تھی۔ اس کا منہ کرب آمیز انداز میں کھلا ہوا تھا مگر وہ چیخ نہیں پا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے سانس نہیں آ رہی ہے۔ پھر اس نے اپنا گلا تھام لیا اور سانس کے لیے تڑپنے لگا۔ شامی نے کہا۔ ''اسے مدد کی ضرورت ہے۔''

''کوئی پاس نہ جائے۔'' نواب صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ ''سب پیچھے ہٹو... یہ کسی کیمیائی یا حیاتیاتی ہتھیار کا شکار ہوا ہے۔''

اسی لمحے پہاڑ کی طرف سے کسی نے فائر کیا اور گولی شامی اور تیمور کے درمیان سے گزر گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ سب مرسیڈیز کی آڑ میں ہو گئے۔ فولاد خان نے پستول نکال لیا تھا مگر نواب صاحب نے اسے فائرنگ سے روکا۔

''انہوں نے آزمانے کے لیے فائر کیا ہے۔''

''کیا مطلب دادا حضور؟'' تیمور نے پوچھا۔

''یہ کسی خودکار رائفل کا فائر ہے۔ اس نے مارنا ہوتا تو وہ برسٹ مارتا۔ وہ زیادہ دور نہیں ہے، شاید سو گز کا فاصلہ ہو گا۔ شاید وہ چیک کر رہا ہے کہ ہمارے پاس ہتھیار ہیں یا نہیں۔''

جوجی ایک ٹائر کے ساتھ سجدے والی پوزیشن میں پڑا تھا اور غالباً ان کے ساتھ آنے پر پچھتا رہا تھا۔ نوشی گاڑی سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ ہراساں نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی ان لوگوں کے ہمراہ مشکل مراحل سے گزر چکی تھی۔ تیمور پیچھے سے اور شامی سامنے والی طرف سے جھانک کر دیکھ رہے تھے کہ فائر کرنے والے کہاں تھے؟ مگر بہت گھنے درختوں اور پھر سورج کی روشنی دوسری طرف ہونے کی وجہ سے وہاں تقریباً اندھیرا تھا اور اس میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جوجی نے کانپتے لہجے میں پوچھا۔ ''شامی بھائی، یہ کیا ہے؟''

''کسی رائفل کا فائر۔'' شامی نے جواب دیا اور نواب صاحب سے پوچھا۔ ''کوئی اضافی ہتھیار ہے؟''

''گاڑی میں ایک پستول ہے۔''

شامی نے دروازہ کھولا اور لیٹے لیٹے اندر سرک کر گاڑی سے پستول اور اس کا اضافی میگزین نکال لیا۔ یہ اعشاریہ تین آٹھ کا کولٹ پسٹل تھا۔ فولاد خان کے پاس بڑا بریٹا تھا۔ تیمور نے کہا۔ ''ہمیں ڈھلان پر جانا ہوگا۔ یہاں

پرہم آسانی سے نشانہ بن جائیں گے۔‘‘

’’پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کے عزائم کیا ہیں اور یہ کتنے ہیں؟‘‘ شامی نے کہا۔ اس کی نظر ساکت ہو جانے والے آدمی پر تھی، اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ شلوار قمیص، نقوش اور سرخ بالوں سے وہ مقامی ہی لگ رہا تھا مگر اب اس کے چھالے بہت تیزی سے بڑھ رہے تھے اور اس کا چہرہ تقریباً ناقابلِ شناخت ہو گیا تھا۔ خاصی دور سے بھی اس کے پاس سے بہت عجیب اور چبھتی ہوئی بدبو ان تک آرہی تھی۔ ’’یہ معاملہ پراسرار لگ رہا ہے۔ دادا حضور کا کہنا ہے کہ یہ کسی کیمیائی ہتھیار کا شکار ہوا ہے۔‘‘

’’دادا جان! آپ یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟‘‘ تیمور نے ادب سے پوچھا۔

’’تم بھول رہے ہو، ہم دوسری جنگِ عظیم لڑ چکے ہیں۔‘‘ نواب صاحب نے کہا۔ ’’اس دوران میں کیمیائی ہتھیاروں کے یونٹ میں بھی کام کیا تھا۔ جرمنوں کے پاس کیمیائی ہتھیار تھے اس لیے ٹریننگ کے دوران ہمیں خاص طور سے ان سے نمٹنے اور بچنے کی تربیت دی گئی تھی۔ پھر ہم نے اس بارے میں مطالعہ بھی کیا ہے۔‘‘

اس میں شبہ نہیں کہ نواب صاحب کی معلومات اور تجربہ ان سے کہیں زیادہ تھا۔ ’’لیکن یہاں اس علاقے میں کوئی کیمیائی ہتھیار کہاں سے آگیا؟‘‘

’’یہ تو یہی بتا سکتا ہے جس نے فائر کیا ہے۔‘‘ نواب صاحب بولے۔ ’’ایسا لگ رہا ہے یہ آدمی کسی قید سے نکل کر بھاگا ہے اور مسلح شخص اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ ممکن ہے اور مسلح افراد ہوں یا آنے والے ہوں۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہوگا۔‘‘

’’ہم سر نیچے کر کے بی ڈرائیو کر سکتا اے۔‘‘ فولاد خان نے اپنی خصوصیت سے آگاہ کیا۔

’’خطرہ شیشوں سے ہے۔‘‘ نواب صاحب بولے۔ ’’باڈی بلٹ پروف ہے۔‘‘

’’تب ہمیں نکل جانا چاہیے۔‘‘ تیمور نے دروازہ کھولا۔

’’ایسے نہیں۔‘‘ نواب صاحب نے اسے گھورا۔ ’’فولاد خان گاڑی ڈرائیو کر کے لے جائے گا اور ہم اس کی آڑ میں ہوں گے۔ اندر ہم سب اتنے محفوظ نہیں ہوں گے۔‘‘

فولاد خان اندر گھسا اور اس نے انجن اسٹارٹ کر کے گیئر بدلا اور مرسیڈیز کو آگے بڑھایا۔ وہ نشستوں کے درمیان گھسا ہوا تھا اور مرسیڈیز میں خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ آنے والے پہلے برسٹ سے بچ گیا۔ برسٹ نے پہاڑ والی سائڈ کے دونوں شیشوں کو چکنا چور کر دیا تھا، البتہ باڈی سے گولیاں اچٹ گئی تھیں۔ تیمور جو پیچھے کی طرف تھا اور اس کے پاس فولاد خان کا بریٹا تھا، اس نے دیکھ لیا اور اسی طرف دو فائر کیے۔ اس کا مقصد جتانا تھا کہ وہ نہتے نہیں ہیں۔ مگر وہ ان کا ارادہ بھانپ گئے۔ اگلے برسٹ نے مرسیڈیز کے دونوں ٹائرز تباہ کر دیے اور وہ ایک طرف سے بیٹھ گئی۔ اس بار فائر ایک اور سمت سے ہوا تھا۔ یعنی کم سے کم دو خودکار ہتھیاروں سے مسلح افراد اوپر موجود تھے۔ نواب صاحب نے فولاد خان کو فوری باہر آنے کا حکم دیا کیونکہ گاڑی ایک طرف جھکنے سے اب وہ خطرے میں آگیا تھا۔ فولاد خان سرک کر باہر آگیا۔ شامی مضطرب ہو رہا تھا، اس نے نواب صاحب سے کہا۔

’’ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔‘‘

’’کیسے؟‘‘ نواب صاحب نے دور کھڑی لینڈ کروزر کی طرف دیکھا، اس تک جانا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ درمیان میں کم سے کم بیس گز کا فاصلہ تھا۔ اگر وہ بہت تیزی سے بھاگتے تب بھی امکان تھا کہ اوپر گھات لگائے لوگ انہیں... بہ آسانی نشانہ بنالیں گے۔

’’ہمیں ڈھلان پر اترنا ہوگا۔‘‘ شامی نے کہا۔ سڑک یہاں مشکل سے دس فٹ چوڑی تھی اور فولاد خان نے کچھ دور تک جو ڈرائیو کی تھی، اس کے نتیجے میں کار ڈھلان کی طرف آگئی تھی۔ ویسے بھی اسے آبلہ زدہ آدمی سے بچ کر گزرنا پڑا تھا۔ اب ڈھلان ان سے دو فٹ دور تھی اور وہ کوشش کرتے تو بچ کر اس پر اتر سکتے تھے۔

’’یہ جگہ نشانے پر ہے؟‘‘ نواب صاحب نے کہا۔

’’ابھی چیک کر لیتے ہیں۔‘‘ شامی نے کہا اور جوجی سے بولا۔ ’’ذرا نیچے جا کر دکھاؤ۔‘‘

’’نہیں جی۔‘‘ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ’’میں آپ کو فالتو نظر آتا ہوں یا قربانی کا بکرا ہوں؟ آپ خود جائیں۔‘‘

’’تب یہیں بیٹھے رہو، وہ آ کر سب سے پہلے تمہارا کام تمام کریں گے۔‘‘ شامی نے کہا اور اچانک دوڑ کر ڈھلان سے اتر گیا۔ نواب صاحب کا دل ایک لمحے کو رکا۔ ناخلف سہی مگر وہ بہرحال ان کا پوتا تھا۔ اوپر سے ایک فائر ہوا مگر گولی کہیں اور گئی۔ شامی اتنی تیزی سے گیا تھا کہ اسے ڈھلان پر رکنے کے لیے ایک درخت سے ٹکرانا پڑا ورنہ وہ

خاصا نیچے جاتا۔ اسے چوٹ آئی تھی مگر وہ رک گیا۔ اگر وہ اسی رفتار سے نیچے جاتا تو اس میں ہڈیاں پسلیاں ٹوٹنے کے امکانات روشن تھے۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ’’سب ایک ایک کر کے آئیں، میں روک لوں گا مگر آنا تیزی سے ہوگا... جھجکنا یا رکنا بالکل نہیں ہے۔‘‘

سب سے پہلے نواب صاحب آئے اور شامی نے بہ مشکل انہیں روکا کیونکہ وہ خاصے بھاری بھرکم تھے۔ وہ تقریباً گزر گئے تھے بس عین موقع پر شیروانی ہاتھ میں آگئی۔ انہوں نے اس حال میں بھی ڈانٹا۔ ’’برخوردار، اس طرح روکتے ہیں۔‘‘

’’سوری دادا جان۔‘‘ شامی نے خفت سے کہا اور عقب سے ان کی شیروانی چھوڑ دی۔ پھر فولاد خان آیا تو کام آسان ہو گیا۔ نوشی کا بوجھ شامی نے خوشی سے برداشت کیا اور اس پر دانت بھی نکالے جس پر نوشی شرمائی اور پھر اسے گھورا۔ اس کے پاس سے نیچے جاتے ہوئے وہ زیرِلب بولی۔

’’بدتمیز۔‘‘

’’بسر و چشم۔‘‘ شامی نے جواب دیا۔ وہ بالکل بھول گیا تھا کہ نوشی کے ساتھ آنے پر وہ کتنا دکھی تھا۔ پھر جوجی جھجک کر آیا اور مرتے مرتے بچا کیونکہ گولی اس کے سر کے پاس سے گزری تھی۔

’’دیکھا جی۔‘‘ اس نے ہانپتے کانپتے ہوئے کہا۔ ’’آپ کی طرح یہ بھی میرے دشمن ہو رہے ہیں، مجھ ہی پر گولی چلائی۔‘‘

’’نیچے ہو جاؤ ورنہ گولی سر میں لگے گی اور اس میں بھرا بھوسا بکھر جائے گا۔‘‘

’’میرے سر میں بھوسا نہیں ہے۔‘‘ جوجی نے جلدی سے سر نیچے کر لیا۔ تیمور اوپر رہ کر جواب دے رہا تھا۔ فولاد خان اس کا ساتھ دینے پر آمادہ تھا۔ مگر شامی نے اسے نیچے جانے کو کہا۔ ’’ان دونوں کی مدد کرو، یہ خود سے نیچے نہیں جا سکیں گے۔‘‘

’’میں چلی جاؤں گی۔‘‘ نوشی نے کہا۔

’’میں نہیں جا سکتا۔‘‘ جوجی نے نفی میں سر ہلایا۔ فولاد خان اس کا بازو پکڑ کر نیچے اترنے لگا۔ سب سے آخر میں تیمور نیچے آیا۔ اس دوران میں اوپر سے رہ رہ کر فائرنگ ہو رہی تھی اور گولیاں درختوں کے اوپری حصوں پر لگ رہی تھیں۔ تیمور نے آتے ہی کہا۔

’’جلدی کرو، وہ تین ہیں اور تینوں ہی خودکار رائفلوں سے مسلح ہیں۔‘‘

’’یہ کیا مصیبت ہیں۔‘‘ شامی نے تقریباً لڑھکتے ہوئے کہا۔

’’مجھے لگ رہا ہے یہاں کوئی چکر چل رہا ہے۔ یہ ویران علاقہ ہے کیونکہ پہاڑ بہت مشکل اور ناقابلِ عبور ہیں۔ آگے تو برف پوش پہاڑ ہیں۔ آبادی بہت کم ہے۔‘‘

’’مگر کیمیائی یا حیاتیاتی ہتھیار سمجھ سے بالاتر ہیں۔‘‘ تیمور نے ایک گری شاخ کو پھلانگتے ہوئے کہا۔ ’’تم نے اس شخص کا حشر نہیں دیکھا، وہ کسی ایسی ہی چیز کا شکار ہوا ہے۔‘‘

’’ہو سکتا ہے اسے کوئی بیماری ہو یا کسی نے اس پر تیزاب پھینک دیا ہو۔‘‘

اسی لمحے انہیں اوپر سے بہت تیز گیس خارج ہونے جیسی آواز سنائی دی۔ انہوں نے رک کر دیکھا۔ سڑک کی طرف سے ایسی روشنی جھلک رہی تھی جیسے وہاں کوئی تیز شعلہ جل رہا ہو۔ تیمور نے کہا۔ ’’میرے خدا! وہ اس کو جلا رہے ہیں۔‘‘

’’جلا رہے ہیں... وہ کیوں؟‘‘

’’میرا خیال ہے یہ کیمیائی کے بجائے بائیولوجیکل ایجنٹ ہے۔ اسی وجہ سے وہ اسے آگ لگا رہے ہیں تاکہ وائرس پھیل نہ سکے۔‘‘

شامی اور تیمور دونوں نے محسوس کیا کہ چکر زیادہ بڑا تھا اور ان کا اس سے دور رہنا ہی مناسب تھا۔ وہ دوبارہ نیچے اترنے لگے۔ اچانک شامی نے رک کر کہا۔ ’’یہ لوگ کہاں ہیں؟‘‘

انہیں آس پاس کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ یہاں جنگل بہت گھنا نہیں تھا اس لیے روشنی نیچے تک آرہی تھی۔ اس روشنی میں انہیں دور تک وہ نظر نہیں آرہے تھے۔ مگر اسی لمحے انہیں فولاد خان نے روکا۔ وہ ایک درخت کی آڑ میں تھا اور اس کے ساتھ جوجی بھی تھا۔ البتہ نوشی اور نواب صاحب نظر نہیں آرہے تھے۔ شامی نے پوچھا۔ ’’دادا جان اور نوشی کہاں ہیں؟‘‘

’’وہ آگے اے۔‘‘ فولاد خان نے کہا۔ ’’ام آپ کا انتظار فرماتا۔‘‘

’’ہمیں ایک جگہ رہنا چاہیے۔‘‘ شامی نے کہا۔ ’’ہمیں واپس ہائی وے کی طرف جانا ہوگا۔‘‘

’’اور گاڑیاں؟‘‘ تیمور نے پوچھا۔

’’وہ یہیں پڑی رہیں، بعد میں منگوا سکتے ہیں۔ اس

وقت تو جان بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔"

کوئی سو گز نیچے آنے کے بعد ڈھلان کم اور آسان ہو گئی تھی۔ مگر اتنی بھی آسان نہیں ہوئی تھی کہ وہ دوڑتے چلے جاتے۔ اس صورت میں نواب صاحب اور نوشی کو پاس ہونا چاہیے تھا مگر وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ شامی فکر مند ہو گیا۔

"دادا حضور اس عمر میں کس رفتار سے گئے ہوں گے۔"

اگر نواب صاحب لڑھک گئے ہوتے تب بھی نوشی ساتھ تھی، اگر وہ ان کو سنبھال نہ پاتی تو انہیں تو بتا سکتی تھی۔ اس طرح خاموش نہ رہتی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ صحیح سلامت تھے مگر کہیں اور نکل گئے تھے۔

"آواز دی جائے۔" تیمور نے تجویز پیش کی اور وہ نواب صاحب کو پکارنے جا رہا تھا کہ شامی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے اوپری درختوں میں کسی کی جھلک دیکھی تھی۔

"شش... نیچے جھک جاؤ۔"

وہ سب پھرتی سے درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔ چند لمحے بعد انہیں اوپر تین افراد حرکت کرتے دکھائی دیے اور وہ ان سے ڈھائی تین سو گز سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اپنے ہتھیاروں اور انداز سے وہ تربیت یافتہ قاتل لگ رہے تھے۔ وہ خطرے میں تھے۔

☆☆☆

نواب صاحب اور نوشی ساتھ ساتھ تھے۔ دراصل نوشی نواب صاحب کو سہارا دے رہی تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس خطرناک ڈھلان پر نواب صاحب اس عمر میں آسانی سے حرکت نہیں کر سکیں گے اور انہیں سہارے کی ضرورت پڑے گی۔ جہاں مشکل گزرگاہ آتی، نوشی انہیں سہارا دیتی تھی۔ یہ کام وہ اتنے غیر محسوس انداز میں کرتی کہ نواب صاحب کو احساس نہیں ہوتا تھا۔ نواب صاحب اس معاملے میں روایتی وضع داری رکھتے تھے کہ ضرورت کے باوجود اپنے چھوٹوں سے مدد نہیں طلب کر سکتے تھے اور یہاں حکم دینے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے وہ نوشی کا سہارا قبول کرتے رہے۔ اس کی وجہ سے نواب صاحب بہت کم وقت میں خاصا نیچے آ گئے تھے پھر ایک جگہ وہ سانس درست کرنے کے لیے رکے تو انہوں نے نوشی کو شاباشی دی۔ "اللہ خوش رکھے، بہت سعادت مند بچی ہو۔"

نوشی شرمائی۔ "میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"

"یہ لوگ کہاں ہیں؟" نواب صاحب نے اوپر دیکھا مگر ان میں سے کوئی نظر نہیں آیا۔ دراصل وہ ڈھلان پر دائیں طرف اتر آئے تھے جبکہ باقی سب بائیں طرف تھے۔ نوشی جس جھاڑی کے پاس تھی، اس نے اسے ہٹایا تو اس کے عقب میں ایک نالا دکھائی دیا۔ اس نے نواب صاحب کو دکھایا۔

"اگر اس میں اتر جائیں تو ہم آرام سے سفر کر سکتے ہیں۔"

"ہاں مگر باقی سب سے الگ ہو سکتے ہیں۔"

نوشی نے سوچا اور سر ہلایا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں ان کو تلاش کرنا ہوگا۔"

"ہمیں ہائی وے کی طرف جانا ہوگا، وہیں سے ہم مدد حاصل کر سکتے ہیں۔"

اسی لمحے اوپر کہیں کوئی شاخ چٹخی اور وہ تیزی سے جھاڑی کی آڑ میں ہو گئے۔ آواز بہت دور سے نہیں آئی تھی۔ پھر اوپر ایک چٹان پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس کے شانے سے لٹکی خودکار رائفل بتا رہی تھی کہ وہ ان میں سے نہیں تھا۔ نواب صاحب نے نوشی کا بازو تھاما اور خاموشی سے نالے میں اتر گئے۔ اس کے دونوں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں اور یہاں وہ اوپر سے آنے والوں کی نظر سے محفوظ تھے۔ وہ نالے میں رک گئے تھے مگر چند منٹ بعد آہٹ نزدیک سے آئی تو انہیں مجبوراً نالے میں ہی آگے سفر کرنا پڑا۔ نالا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مشکل سے چار فٹ چوڑا ہوگا اور اس کی تہ تو بس ایک ڈیڑھ فٹ چوڑی تھی۔ اس پر چھوٹے پتھروں اور بجری کی تہ جمی تھی۔ اس پر چلنا آسان تھا اور سہارے کے لیے وہ جھاڑیوں کو پکڑ سکتے تھے مگر یہاں احتیاط سے کام لے رہے تھے کہ جھاڑی ہلنے سے پیچھے آنے والوں کو پتا چل جاتا۔ مگر جب وہ تقریباً سو گز نیچے آ گئے تو اچانک نوشی کا پاؤں کسی پتھر پر آیا اور وہ چیخ اٹھی۔ فوراً ہی اوپر سے کسی نے کہا۔ "ہیئر... لک ڈیٹ۔"

"امریکی۔" نواب صاحب نے زیرِ لب کہا اور نوشی سے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"پاؤں مڑ گیا ہے۔" وہ کراہی۔ اصل میں اس نے عام سینڈل پہنا ہوا تھا اور اس کا تلا سپاٹ لیکن پیچھے سے خاصا اونچا تھا۔ پہاڑی اور ناہموار راستوں پر سفر کے لیے ناموزوں تھا۔ مگر اس نے کب سوچا تھا کہ اسے یوں پہاڑوں پر بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔ نواب صاحب نے اس کا پاؤں ٹٹولا تو ٹخنے کے پاس ورم محسوس ہوا۔ چوٹ سنگین لگ رہی تھی ورنہ اتنی تیزی سے ورم نہ ہوتا۔ اب تک نوشی انہیں سہارا دیتی آئی تھی مگر اب انہیں اسے سہارا دینا

تھا۔ انہوں نے نوشی کا ہاتھ تھاما اور بولے۔

"اپنا بوجھ مجھ پر ڈال میری بچی۔"

"شکریہ انکل۔" نوشی نے کہا اور وہ دونوں پھر نیچے کی طرف بڑھنے لگے۔ اسی لمحے کسی نے اوپر سے برسٹ مارا۔

☆☆☆

فائرنگ کے شور نے انہیں چونکا دیا تھا۔ آواز دائیں طرف سے آئی تھی اور ان سے خاصے فاصلے پر فائرنگ ہوئی تھی۔ شامی نے کہا۔ "میرا خیال ہے دادا جان اور نوشی اسی طرف گئے ہیں۔"

"تو یہ فائرنگ..." تیمور کہتے کہتے رک گیا۔

"ہمیں اسی طرف جانا ہوگا۔" شامی نے کہا۔ وہ ڈھلان کے نچلے حصے تک آ گئے تھے اور یہاں انہیں دو پہاڑوں کے درمیان بہنے والا دریا نظر آ رہا تھا مگر وہ ابھی خاصا نیچے تھا۔ یہاں درخت کم اور جھاڑیاں زیادہ تھیں اس لیے روشنی بھی زیادہ تھی۔ اس لیے ان کے دیکھ لیے جانے کا امکان بھی زیادہ تھا۔ مگر وہ رک نہیں سکتے تھے اور اس فائرنگ نے ان کو پریشان کر دیا تھا۔ اگرچہ ایک برسٹ کے بعد دوبارہ کوئی آواز نہیں آئی تھی لیکن دو افراد کے لیے یہ ایک برسٹ بھی کافی سے زیادہ تھا۔ اب ہتھیار تیمور اور فولاد خان کے پاس تھے۔ تیمور کا نشانہ بہتر تھا اس لیے کولٹ اس نے اپنے پاس رکھا۔ شامی نے ایک شاخ اٹھالی تھی... بہ وقتِ ضرورت وہ اس سے ہتھیار کا کام لے سکتا تھا۔ اچانک انہیں کسی نے للکارا۔

"ہینڈز اپ۔"

"بھاگو۔" تیمور نے کہا تو وہ سب بھاگے، اسی لمحے اوپر سے برسٹ مارا گیا مگر وہ ان سے دور گیا تھا۔ وہ کھلی جگہوں کے بجائے جھاڑیوں میں دوڑ رہے تھے۔ جوجی ویسے تو مر مر کر چل رہا تھا مگر جب جان پر بنی تو وہ بھاگنے میں سب سے آگے تھا۔ شامی نے کہا۔

"دریا کی طرف نکلو، وہاں زمین ہموار ہے۔"

"کُلا جگا اے، سب مارا جائے گا۔" فولاد خان نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ایک برسٹ کے بعد دوبارہ فائرنگ نہیں ہوئی تھی مگر وہ رکے بغیر بھاگتے چلے گئے۔ پھر یہاں ڈھلان ایسی تھی کہ تیز رفتاری کی کوشش میں وہ سب خود بہ خود دریا کے کنارے جا نکلے۔ یہ اصل میں ندی تھی مگر گرما کی وجہ سے پانی بہت زیادہ تھا اور یہ دریا کا منظر پیش کر رہی تھی۔ فولاد خان کی بات درست نکلی۔ کھلی جگہ آتے ہی وہ پیچھا کرنے والوں کی نظر میں آ گئے تھے۔ وہ مشکل سے دو سو گز آگے گئے ہوں گے کہ عقب سے دو مسلح افراد نمودار ہوئے۔ شامی مڑ کر دیکھ رہا تھا اور اس کا دیکھنا کام آ گیا۔ اس نے چلا کر کہا۔

"لیٹ جاؤ۔"

وہ گرے اور گولیاں ان کے سروں پر سے گزر گئیں۔ وہ پتھروں کی آڑ لے رہے تھے اور حملہ آور مسلسل گولیاں برسا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ انہیں مارنے کا تہیہ کر کے آئے تھے۔ فائرنگ کرتے ہوئے وہ ان کی طرف ہی آ رہے تھے۔ اگر وہ کچھ آگے آ جاتے تو پھر یہ معمولی پتھر انہیں نہیں بچا سکتے تھے۔ ایسے میں تیمور نے ہمت کی اور پلٹ کر پستول ان کی طرف کر کے لگاتار فائر کیے۔ اس نے پورا میگزین خالی کر دیا تھا مگر اس کا فائدہ ہوا۔ آگے والا اچانک الٹ کر گرا۔ اسے گولی لگی تھی اور اس کا ساتھی فائرنگ بھول کر اسے گھسیٹ کر ایک بڑے درخت کی آڑ میں لے جانے لگا۔ فائرنگ رک گئی تھی۔ فولاد خان اس پر فائرنگ کرنے جا رہا تھا مگر شامی نے اسے روک دیا۔

"یہاں سے نکلو... ہم خطرے میں ہیں۔"

"کہاں جائیں؟" جوجی نے پوچھا۔

"دریا میں۔" شامی نے دھارے کی طرف دیکھا۔ "یہ تیزی سے ہمیں یہاں سے دور لے جائے گا۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اٹھ کر ہم چار قدم بھی نہیں بھاگ سکتے۔"

"اس کا دھارا دیکھ رہے ہو، یہ ہمیں مار دے گا۔" تیمور نے اعتراض کیا۔

"میں تیرنا نہیں جانتا۔" جوجی نے بھی انکار کیا۔

مگر فولاد خان نے تائید کی۔ "شامی صیب ٹھیک فرماتا اے... ام ندی سے نکل سکتا اے۔"

پیچھا کرنے والے نے محفوظ مقام پر پہنچتے ہی ان کی طرف برسٹ مارا تھا اور وہ بحث بھول کر بے ساختہ ندی کی طرف سرکنے لگے۔ اس بار بھی جوجی نے سبقت رکھی۔ حالانکہ اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ البتہ اسے پانی میں دھکا فولاد خان نے دیا۔ جوجی نے چیخ ماری اور واپس آنے کی کوشش کی۔ تیمور اور شامی ایک ساتھ پانی میں اترے تھے۔ اس دوران میں بچنے والا رہ رہ کر گولیاں برسا رہا تھا مگر درمیان میں اتنے پتھر تھے کہ اس کی چلائی گولیاں ان تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر رہی تھیں۔ فولاد خان نے دھارے میں جانے سے پہلے جوجی کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی ورنہ وہ وہیں

رہ جاتا اور مارا جاتا کیونکہ اس میں پانی میں اترنے کی ہمت نہیں تھی۔ پانی کی رفتار بہت تیز تھی، وہ سیکنڈوں میں کہیں کے کہیں جا نکلے تھے۔ جوجی غوطے کھا رہا تھا اور فولاد خان اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''خدائی... خوار... آرام سے... انسان کا بچہ بنو... آت مت چلاؤ... ٹانگ چلاؤ... او بدبخت امارا گردن مت پکڑو...''

تیمور اور شامی اسی چکر میں آگے نکل گئے تھے۔ فائرنگ کرنے والا انہیں یوں فرار ہوتے دیکھ کر آڑ سے نکل کر ان کی طرف دوڑا۔ مگر ان کی رفتار کہیں تیز تھی۔ پھر بھی اس نے انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر اس بار بھی ناکامی اس کا مقدر رہی۔ تیز رفتار دھارے میں وہ اس طرح ڈوبتے ابھرتے جا رہے تھے کہ حملہ آور کو ٹھیک سے نظر بھی نہیں آ رہے تھے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور اب کنارے کی طرف آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تیمور کسی طرح ندی کی ایک چٹان کو پکڑنے میں کامیاب رہا۔ پھر شامی نے تیمور کو پکڑا اور اسی چٹان پر چڑھ گیا۔ تب اس نے دیکھا آگے ندی آبشار کی صورت میں گر رہی تھی۔ اگر فولاد خان اور جوجی اس آبشار سے گرتے تو ان کا بچنا محال لگ رہا تھا۔ اگر بچ جاتے تب بھی جوجی فولاد خان کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ الگ ہوتا تو فوراً ڈوب جاتا۔ شامی نے چلا کر تیمور کو بتایا۔ پھر اس نے چٹان پر لیٹ کر تیمور سے کہا۔ ''میں تمہارا ہاتھ پکڑتا ہوں، تم فولاد خان کو پکڑنے کی کوشش کرو۔''

''فولاد خان۔'' تیمور نے اپنی طرف آتے فولاد خان اور جوجی کو دیکھا۔ ''کہیں یہ مجھے بھی نہ لے جائیں۔''

اس دوران میں شامی نے اپنی تجویز میں ترمیم کرتے ہوئے اپنی پتلون سے بیلٹ کھینچ لی اور تیمور نے اسے تھام کر چٹان چھوڑ دی۔ یہ زیادہ آسان تھا۔ شامی خود کو چٹان پر قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر جب تیمور نے فولاد خان کو پکڑا تو جھٹکا اتنا شدید تھا کہ وہ بس پانی میں جاتے جاتے بچا۔ نہ جانے کیسے اس نے خود کو اپنی جگہ قائم رکھا۔ پھر اس نے بیلٹ کھینچی اور وہ تینوں ایک ایک کر کے کنارے پر چڑھ گئے۔ جوجی خاصا پانی نوش کر چکا تھا اور اس کی حالت بری تھی۔ وہ بری طرح کھانس رہا تھا اور اس کے ناک منہ سے پانی نکل رہا تھا۔ وہ دہرا ہوا جا رہا تھا۔ جب فولاد خان نے اس کی کمر پر دو مکے مارے تو اس کے پھیپھڑوں میں پھنسا پانی نکلا اور اس کی کھانسی رکی۔

''میں... مرتے... مرتے بچا۔'' اس نے رک رک کر کہا۔

''لیکن مرے نہیں۔'' تیمور نے اسے تسلی دی۔

''ہمیشہ کی طرح۔'' شامی نے کہا۔

فولاد خان کا پستول محفوظ تھا کیونکہ اس نے اسے ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ تیمور نے پہلے ہی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔ دونوں ہتھیار بھیگ گئے تھے مگر اعلیٰ درجے کے تھے اس لیے انہیں امید تھی کہ وہ بہ وقتِ ضرورت کام کریں گے۔ وہ تقریباً ایک کلومیٹر آگے نکل آئے تھے۔ اب انہیں نواب صاحب اور نوشی کی فکر ہو رہی تھی۔

☆☆☆

برسٹ اندازے سے یا انہیں ڈرانے کے لیے مارا گیا تھا اس لیے گولیاں کہیں دور گئیں اور وہ محفوظ تھے۔ نواب صاحب نے بروقت نوشی کے منہ پر ہاتھ رکھا ورنہ وہ چیخ مارنے والی تھی۔ وہ آہستہ سے بولے۔ ''آواز نہ نکلے۔ اب وہ آواز سے ہمارا پتا چلانے کی کوشش کریں گے۔''

نوشی کے پاؤں کی تکلیف کسی قدر کم ہوئی تھی اور اب وہ اس پر بھی زور دے کر چل رہی تھی۔ ''یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟''

''خدا جانے مگر یہ ہمارے درپے ہیں۔ سامنا ہوتے ہی مارنے کی کوشش کریں گے اس لیے ان سے دور رہنا ہی مناسب ہوگا۔''

نالا اب نشیب کی طرف جا رہا تھا اور اگر اوپر بارش ہوئی ہوتی تو اس میں پانی ہوتا لیکن وہ خشک تھا۔ کہیں کہیں مٹی گیلی تھی اور گھاس اگ آئی تھی۔ نواب صاحب کا کلا جھاڑیوں سے الجھ رہا تھا اس لیے انہوں نے اتار کر وہیں چھوڑ دیا۔ یہ کلا انہیں بہت عزیز تھا مگر بہرحال جان سے بڑھ کر نہیں تھا۔ بالآخر وہ کسی قدر ہموار زمین تک پہنچے اور انہیں سامنے دریا نظر آنے لگا۔ اس میں پانی خاصا زیادہ تھا۔ اچانک ہی فائرنگ کی آواز آئی۔ خودکار رائفلیں گولیاں برسا رہی تھیں پھر جواب میں پستول کی آواز بھی آئی اور اس کے بعد انہوں نے اپنے سامنے سے دریا میں شامی، تیمور، جوجی اور فولاد خان کو گزرتے دیکھا۔ ''انکل، وہ دیکھیں۔'' نوشی نے جوش سے کہا۔

وہ باہر نکلنا چاہتی تھی مگر نواب صاحب نے روک لیا۔ ''صبر... وہ لوگ بھی پاس ہیں۔''

نواب صاحب کی بات درست ثابت ہوئی۔ جب ایک سفید فام دکھائی دیا جو ان چاروں پر فائرنگ کر رہا تھا مگر

نواب صاحب کو امید تھی دریا جس رفتار سے بہہ رہا تھا، وہ خاصا آگے جا چکے ہوں گے۔ انہوں نے خود سے کہا۔ ''کوئی بڑی گڑبڑ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' نوشی بولی۔

''جس نے ہمیں للکارا تھا، وہ امریکی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ ابھی جو شخص نظر آیا ہے، وہ بھی سفید فام ہے۔ یہ اس علاقے میں کیا کر رہے ہیں؟ ہماری معلومات کے مطابق اس علاقے میں ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے جس میں غیر ملکی کام کرتے ہوں۔ ویسے بھی یہ علاقہ بین الاقوامی طور پر متنازعہ ہے۔''

''آپ جانتے ہیں پچھلے دورِ حکومت میں یہاں غیر ملکیوں کا اثر رسوخ بہت بڑھ گیا تھا۔ بے تحاشا ڈپلومیٹک ویزے ایشو کیے گئے۔ کہا جا رہا ہے ان میں بہت سے جاسوس اور ایسے لوگ بھی ہیں جو یہاں سازشوں کا جال بچھانے آئے ہیں۔''

نواب صاحب گہری سانس لے کر رہ گئے۔ ''ان کو ویزے ہمارے لوگوں نے دیے۔ وہ بھی اس ملک کی جڑیں کاٹنے والوں میں شامل ہیں۔''

''اصل مجرم یہی لوگ ہیں۔'' نوشی نے کہا۔ وہ ذرا آگے بڑھی اور جھاڑیوں سے باہر جھانکا۔ اسی لمحے رائفل کی نال آ کر اس کے سر سے لگ گئی اور وہ ساکت ہو گئی۔ نواب صاحب کو ذرا تاخیر سے پتا چلا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے، وہ نہتے تھے۔ رائفل بردار وہی تھا جس کے ساتھی کو تیمور نے زخمی کیا تھا۔ نہ جانے کیسے وہ یہاں ان کی موجودگی بھانپ گیا تھا اور بالکل خاموشی سے آیا تھا۔ انہیں اس کی آمد کا قطعی پتا نہیں چلا تھا۔

''باہر آؤ... دونوں ہاتھ اوپر۔'' اس نے صاف انگریزی میں کہا۔

دوسرا آدمی پیچھے سے آیا تھا۔ یہ کارل تھا۔ سامنے والا مائیکل تھا اور ریش زخمی تھا۔ گولی اس کے شانے پر لگی تھی۔ وہ تینوں کمانڈوز جیسے لباس میں تھے اور پوری طرح مسلح تھے۔ ان کے پاس ہینڈ گرینیڈ اور اسموک گرینیڈ تک تھے۔ مائیکل نے پوچھا۔ ''تمہارے ساتھ اور کون ہے؟''

''بس ہم دو ہیں۔'' نواب صاحب نے جواب دیا۔ ان کا اندازہ اس بار بھی درست نکلا تھا۔ وہ تینوں امریکی لہجے میں بات کر رہے تھے اور ان کے خدوخال بھی اس بات کی گواہی دے رہے تھے۔ مگر وہ انجان بن کر بولے۔ ''تم کون ہو... انگریز؟''

''وہ چاروں کہاں ہیں؟'' مائیکل نے سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔

''وہ ہمارے سامنے دریا سے گزرے ہیں۔'' اس بار نوشی بولی۔ اس پر تینوں نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ نوشی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''آگے آبشار ہے۔'' کارل نے کہا۔ ''اس میں بہت بڑے پتھر ہیں۔ ان پر گرنے والا بچتا نہیں ہے۔''

''وہ چاروں مارے گئے ہوں گے۔'' مائیکل نے سر ہلایا۔

''میری خواہش ہے، وہ بچ جائیں اور میں انہیں اپنے ہاتھ سے ماروں۔'' ریش نے کہا۔ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ ''خیر یہ دونوں بھی ہاتھ آئے ہیں۔''

مائیکل ذرا دور جا کر واکی ٹاکی پر رپورٹ کرنے لگا۔ نواب صاحب اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ چند منٹ بعد واپس آیا اور بولا۔ ''ان کو لے چلو، تم دونوں جاؤ گے... میں ان چاروں کو دیکھوں گا۔ ناؤ گو۔''

☆☆☆

''اب کیا کریں؟'' تیمور نے پوچھا۔

''ہمیں یہاں سے فوراً چلے جانا چاہیے۔'' جوجی نے تجویز دی۔

شامی نے اسے گھورا۔ ''دادا جان اور نوشی کو چھوڑ کر؟''

''اچھی بات ہے، آپ ان سے ویسے ہی بیزار ہیں۔'' جوجی نے روانی سے کہا اور جب تیمور اور شامی نے اسے گھورا تو وہ بوکھلا کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے، وہ بھی ہماری طرح بچ کر نکل گئے ہوں گے۔''

فولاد خان جو ایک طرف بلند چٹان پر چڑھ کر لیٹا ہوا تھا، اس نے آواز دے کر ان کو بلایا۔ ''تیمور صیب... شامی صیب ادر آ کر دیکو۔''

انہوں نے چٹان پر چڑھ کر دیکھا تو تقریباً نصف کلومیٹر دور انہیں چند افراد دکھائی دیے۔ وہ واضح نہیں تھے مگر ایک نے بلیو جینز کے ساتھ پنک شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ یہ نوشی کا لباس تھا۔ اسی طرح نواب صاحب کی شیروانی بھی واضح تھی۔ ان کے پاس تین افراد اور تھے۔ تیمور نے فکر مندی سے کہا۔ ''انہوں نے دادا جان اور نوشی کو پکڑ لیا ہے۔''

''وہ انہیں لے جا رہے ہیں۔'' شامی نے اشارہ کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ دو افراد نوشی اور نواب صاحب کو گن

پوائنٹ پر لے جا رہے تھے جبکہ تیسرا وہیں تھا اور پھر وہ جھاڑیوں میں گھس گیا جبکہ باقی دو نواب صاحب اور نوشی کو لے کر ڈھلان والی طرف غائب ہو گئے۔ فولاد خان نے یقین سے کہا۔ ”یہ خنزیر امارے واسطے رکا اے۔“

”فولاد خان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ چھپ کر ہمارا انتظار کرے گا اور جیسے ہی ہم سامنے آئیں گے یا تو شوٹ کر دے گا یا پھر ہینڈز اپ کر کے ہمیں بھی لے جائے گا۔“ تیمور نے کہا۔

”آپ بولے تو ام اس کو قبائلی طریقے سے جہنم رسید فرما دے۔“ فولاد خان نے پوچھا۔ نواب صاحب کی موجودگی میں وہ اکثر فرمانے لگ جاتا تھا۔ یعنی اس گفتگو میں لفظ فرمانا بہت آتا تھا۔

”ہمیں اس کو ٹریپ کرنا ہوگا۔“ شامی نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ”کیونکہ یہی بتا سکتا ہے کہ اس کے ساتھی دادا حضور اور نوشی کو کہاں لے گئے ہیں۔“

”لازمی بات ہے یہی ان کا کوئی ٹھکانا ہوگا۔“ تیمور نے کہا۔ ”لیکن وہ پوری طرح مسلح ہے اور ہمارے پاس صرف دو پستول ہیں جو بھیگ بھی گئے ہیں۔“

”رسک لینا ہوگا۔“ شامی نے کہا۔

”میری ایک تجویز ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”ہم میں سے دو دادا حضور والی پارٹی کے پیچھے جائیں اور دو اسے قابو کرنے کے لیے یہاں رکیں۔“

”وہ تو خاصا اوپر جا چکے ہوں گے۔“

”نہیں، ان کے ساتھ دادا جان ہیں وہ تیز نہیں چل سکتے۔ ہم تیز چلیں تو ان تک پہنچ سکتے ہیں۔“

”اس طرف سے ممکن نہیں ہے۔“ تیمور نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ گھات لگائے بیٹھا ہے۔“

”ہم اسی جگہ سے اوپر جائیں گے۔“ شامی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے میں جوجی کو لے جاتا ہوں۔ تم فولاد خان کے ساتھ اسے قابو کرو۔ ایک ہتھیار مجھے دے دو۔“

تیمور نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنا کولٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا؟“

شامی نے اپنی تجویز کی وضاحت کی۔ ”ہم اس شخص پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے وہ بتانے سے انکار کر دے یا سرے سے ہاتھ ہی نہ آئے تب ہم ان لوگوں کو کہاں تلاش کریں گے۔ یہاں پولیس تو دور رہی، عام آبادی تک نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ تیمور نے سر ہلایا۔ ”میں اور فولاد خان اسے قابو کرتے ہیں۔“

”مجھے آپ کے ساتھ جانا ہوگا؟“ جوجی نے مرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم اپنے باپ کا نام بدنام کر رہے ہو۔“ شامی نے ملامت کی۔ ”وہ شہر کا اتنا بڑا بدمعاش ہے اور اس کا اکلوتا بیٹا اتنا بزدل۔“

”اباجی کا نام پہلے ہی بدنام ہے اور میں بزدل ہی بھلا۔“ جوجی نے کہا لیکن شامی اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اسے کھینچ کر لے گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ڈھلان پر چڑھ رہے تھے۔ شامی آگے تھا اور جوجی پیچھے۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”شامی بھائی، یہ کون ہو سکتے ہیں؟“

”مجھے تو غیر ملکی ایجنٹ لگ رہے ہیں جن کی ہمارے ملک میں تعداد اتنی ہو گئی ہے کہ ہر شخص کے حصے میں کم سے کم ایک ایجنٹ تو آئے گا۔“

”اباجی کہہ رہے تھے کہ اب غیر ملکی اسلحہ اتنا ہو گیا ہے کہ دیسی اسلحے میں مزہ ہی نہیں آتا۔“

”تمہیں پستول چلانا آتا ہے؟“

”ویڈیو گیم کی حد تک۔“ جوجی نے فخر سے کہا۔ ”میرا نشانہ کبھی خالی نہیں جاتا۔“

”یہ ویڈیو گیم نہیں ہے، زندگی اور موت کی اصلی جنگ ہے۔“

”میں نے کبھی اصلی گن نہیں پکڑی۔ اس پر ایک بار اباجی نے بہت مارا تھا۔ وہ تو ماں جی درمیان میں آ گئیں ورنہ انہوں نے ڈنڈے کے بعد پستول بھی اٹھا لیا تھا۔“

”وہ جو ہمارے ساتھ شکار پر گن چلاتے رہے ہو؟“

”وہ دوسری بات ہے۔ انسانوں پر ہتھیار اٹھانے کے خیال سے ہول آتا ہے۔ اسی بات پر تو اباجی کو تاؤ آتا ہے اور وہ ڈنڈا اٹھا لیتے ہیں۔“

”ادھر دادا جان بھی کم نہیں ہیں۔“ شامی نے سرد آہ بھری۔ ”زبان سے ایسا تشدد کرتے ہیں کہ انسان کی روح بلبلا جاتی ہے اس اورل تھرڈ ڈگری پر۔“

گفتگو کے دوران وہ اوپر پہنچ گئے۔ شامی بھی یہی چاہتا تھا کہ جوجی کے قدم نہ رکیں ورنہ وہ ایک نمبر کا ہڈحرام بھی تھا۔ وہ اسے باتوں میں لگا کر اوپر لے آیا تھا۔ یہاں سڑک ذرا نیچی تھی اس لیے وہ جلدی پہنچ گئے۔ پہاڑی ڈھلان کے بعد یہ ٹوٹی پھوٹی اور گڑھوں سے بھری سڑک ان کے لیے ریڈ کارپٹ بن گئی تھی۔ شامی نے گاڑیوں کی طرف دوڑنا شروع کیا تو جوجی نے بادل ناخواستہ اس کا

ساتھ دیا۔ پونے پانچ ہو رہے تھے اور ابھی سورج ڈوبنے میں خاصا وقت تھا مگر پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ پانچ بجے وہ گاڑیوں کے پاس پہنچے لیکن ان کے نزدیک جانے کے بجائے شامی نے جوجی سمیت اوپری ڈھلان کی راہ لی جس طرف سے وہ آدمی آیا تھا جس کی جلی لاش اب سڑک پر پڑی تھی۔ شعلے بجھ گئے تھے مگر اس سے دھواں اٹھ رہا تھا اور فضا میں جلنے کی چراند پھیلی ہوئی تھی۔ شامی کو خطرہ تھا کہ گاڑیوں کے پاس بھی کوئی گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ جوجی نے پوچھا۔ ”اب کہاں جا رہے ہیں؟“

”وہ اس طرف سے آئے تھے تو لازمی بات ہے ان کا ٹھکانا اسی طرف کہیں ہوگا۔“

”اتنے خطرناک لوگوں کا ٹھکانا۔“ جوجی پریشان ہو گیا۔ ”کیا ہمیں وہاں گھسنا ہوگا؟“

”اگر ضرورت پڑی تو ایسا بھی کرنا ہوگا۔“ شامی نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ پتھر پھینک کر مار سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں جی، بچپن میں ہمیشہ جیت جاتا تھا جب پتھر پھینکنے کا مقابلہ ہوتا تھا۔“ جوجی نے سینہ تان کر کہا۔

”بس تو دشمن کا سامنا ہو تو پتھر سے کام چلانا۔“

جوجی کا سینہ واپس اندر چلا گیا۔ ”وہ جواب میں پتھر نہیں مارے گا، گولی مارے گا۔“

”اب خاموشی سے چلو، کسی وقت بھی دشمن سے سامنا ہو سکتا ہے۔“ شامی نے کہا۔ وہ اس نسبتاً ہموار ڈھلان پر اوپر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہاں درخت بہت اونچے تھے مگر ذرا فاصلے پر تھے اس لیے ان کے درمیان راستہ تھا۔ شامی سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ ان کے دشمن ہو رہے تھے ان کو دیکھتے ہی فائر کھول دیتے تھے، تب وہ دادا جان اور نوشی کو زندہ کیوں لے گئے تھے؟ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی کہ وہ ان سے ان چاروں کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے۔ وہ سب کو ایک ساتھ دنیا سے رخصت کرنا چاہتے تھے۔ پندرہ منٹ بعد وہ ڈھلان کے اوپری حصے میں پہنچ گئے۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ سے نکلے تھے کہ انہیں سامنے ریسٹ ہاؤس کی خستہ حال عمارت دکھائی دی اور پھر نواب صاحب، نوشی اور دونوں مسلح افراد زمین میں غائب ہوتے نظر آئے۔ جوجی دنگ رہ گیا۔

”یہ کہاں چلے گئے؟“

”کوئی خفیہ راستہ ہے۔“ شامی نے کہا۔ ”عمارت کا داخلی دروازہ دیکھو، اس کے آگے کتنا ملبا پڑا ہے۔ یہاں سے گزر کر کون جا سکتا ہے۔ اس لیے آنے جانے کے لیے خفیہ راستہ رکھا ہوا ہے۔“

وہ جگہ ان سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھی اس لیے وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ راستہ کس نوعیت کا تھا۔ شامی سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے جوجی سے کہا۔ ”تم یہیں رکو اور اگر میں واپس نہ آؤں تو جا کر تیمور اور فولاد خان کو تلاش کر کے اس عمارت کے بارے میں بتانا اور اگر وہ بھی نہ ملیں تو ہائی وے تک جا کر مدد لانا۔“

”اگر وہاں بھی کوئی نہ ملا تو کیا میں گھر چلا جاؤں؟“ جوجی نے سادگی سے سوال کیا۔

”لگتا ہے تمہیں ساتھ لے جانا پڑے گا۔“

”نہیں... نہیں، میں سمجھ گیا۔“ جوجی نے جلدی سے کہا۔ ”جیسا آپ کہیں گے، میں ویسا ہی کروں گا۔ آپ جائیں جی۔“

”گڈ بوائے۔“ شامی نے اس کا شانہ تھپکا اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

نواب صاحب اور نوشی اس خفیہ راستے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ریسٹ ہاؤس کے چار فٹ اونچے پتھر سے بنے چبوترے کے سامنے زمین سے ایک تختہ مع گھاس اور پودوں کے اوپر اٹھا تھا اور اس کے نیچے سیڑھیاں اندر جا رہی تھی۔ وہ انہیں اس مشکل ترین راستے پر ہانکتے ہوئے لائے تھے اور ان کا انداز اہانت آمیز تھا جیسے وہ انہیں بہت حقیر خیال کر رہے ہوں۔ ساتھ ہی فحش بکواس بھی کر رہے تھے۔ نواب صاحب اور نوشی سن اور سمجھ رہے تھے مگر صبر کرنے پر مجبور تھے۔ نوشی کی فکر بڑھ رہی تھی۔ وہ لڑکی تھی اور اسے جان کے ساتھ عزت کا خطرہ بھی لاحق ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ اپنے انداز سے پیشہ ور قاتل اور باتوں سے اوباش لگ رہے تھے۔ نواب صاحب پہلے ہی خاصی بھاگ دوڑ کر چکے تھے اور اس پر انہیں یہ مشکل ڈھلان سر کرنی پڑی تھی مگر جب ان کے قدم سست ہوتے تو کارل انہیں دھکا دیتا۔ نوشی ایک بار اس سے الجھ گئی مگر نواب صاحب نے اسے روکا۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”ان کے منہ مت لگو، ابھی ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا۔“

کارل نے نواب صاحب اور نوشی کی تلاشی لے کر ان کے پاس سے نکلنے والی تمام چیزیں اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔ انہوں نے ریش کے اندر جانے کے بعد انہیں اشارہ کیا اور وہ بادل ناخواستہ سیڑھیاں اترنے لگے۔ دروازہ خود بہ خود کھلا تھا۔ نواب صاحب دیکھ رہے تھے، ان دونوں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ ان کے نیچے آتے ہی دروازہ خود بہ خود بند ہو گیا۔ اس راستے کو کہیں اور سے کھولا اور بند کیا جا رہا تھا۔ نیچے کسی فائبر قسم کے مادے کی بنی ہوئی صاف ستھری سی سرنگ تھی جس میں ہر ایک گز کے فاصلے پر ایک پینل لائٹ روشن تھی۔ کچھ دور ایسی ہی سیڑھیاں دوبارہ اوپر جا رہی تھیں مگر یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ یہ گول کمرا تھا جو مکمل طور پر بند تھا۔ جیسے ہی وہ اندر آئے، اوپر لگے شاورز سے اوزون برسنے لگی۔ اس کی پھوار ایک منٹ تک جاری رہی اور پھر رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور وہ ایک بڑے ہال میں آئے۔ نواب صاحب کا اندازہ تھا کہ وہ ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے اندر پہنچ چکے ہیں۔ مگر اندر سے اس کی حالت بالکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ یہاں دیواروں پر چمکیلی ایلومینیم فوائل کی شیٹ چڑھی ہوئی تھی اور بہت بڑا ہال جو تقریباً پورے ریسٹ ہاؤس کی عمارت پر مشتمل تھا اس میں دھات، شیشے اور فائبر سے بنے ہوئے کمرے اور دوسری جگہیں تھیں۔ یہ سب آسانی سے استعمال ہونے والا میٹریل تھا۔ انہیں جوناتھن کے سامنے پیش کیا گیا۔

”تم لوگ کون ہو اور ہمیں کیوں پکڑا ہے؟“ نواب صاحب نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ”ہم عام مسافر ہیں اور سڑک سے گزر رہے تھے۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔“ جوناتھن مسکرایا۔ ”لیکن بدقسمتی سے تم نے ایک ایسے شخص کو چھو لیا یا اس کے پاس گئے جو مہلک حد تک بیمار تھا۔ اب یہاں تم دونوں کا معائنہ ہوگا کہ کہیں تمہیں بھی تو وہ وائرل نہیں لگ گیا ہے۔“

”میرا خیال ہے تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ کوئی علاج گاہ ہے جہاں بہت متعدی بیماریوں کا شکار ہونے والے رکھے جاتے ہیں؟“

نواب صاحب کی صاف گوئی کا جوناتھن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے سکون سے کہا۔ ”بالکل... وہ ہمارا ایک مریض تھا جو کسی طرح یہاں سے نکل گیا اور تم نے اسے دیکھا۔“

”ہم میں سے کسی نے اسے نہیں چھوا تھا۔ وہ ہمارے سامنے مر گیا تھا اور تمہارے آدمیوں نے اس کی لاش جلا دی تھی۔“

جوناتھن نے شانے اچکائے۔ ”یہ ضروری تھا کیونکہ اسے بہت مہلک وائرس لگا ہوا تھا۔ اگر یہ وائرس پھیل جائے تو بہت تباہی مچا سکتا ہے کیونکہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔“

نواب صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میری معلومات کے مطابق ایسا کوئی قدرتی وائرس نہیں ہے جو بالکل لاعلاج ہو۔“

جوناتھن کی آنکھوں میں چمک آئی۔ ”اولڈ مین! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”مجھے لگ رہا ہے کہ یہ جگہ کوئی تجربہ گاہ ہے اور تم اس پر کوئی تجربہ کر رہے تھے جو یہاں سے نکل بھاگا۔“ نواب صاحب نے مزید صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ”تمہارے آدمیوں نے ہمیں مارنے کی پوری کوشش کی لیکن پھر ہمیں گرفتار کر کے یہاں لے آئے۔“

”کیونکہ انہیں میں نے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔“

”تم یہاں کے انچارج ہو؟“ نوشی بولی۔ ”کیا تم ہم پر بھی تجربہ کرنا چاہتے ہو؟“

”تم کچھ بھی سمجھنے کے لیے آزاد ہو۔“ جوناتھن نے کہا اور کارل کو اشارہ کیا۔ ”انہیں دو نمبر میں بند کر دو۔“

کارل ان کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے گن کی نال سے اشارہ کیا۔ ”چلو۔“

نواب صاحب اور نوشی حرکت میں آئے اور انہیں ہال کے اوپر ایک کونے میں بنے شیشے کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ وہاں ایک دھاتی میز کے گرد دھات اور فوم کی بنی چار کرسیاں رکھی تھیں۔ نوشی اوپر سے حوصلہ دکھا رہی تھی لیکن اندر سے پریشان تھی۔ اس نے دروازہ بند ہوتے ہی کہا۔

”انکل! مجھے یہ لوگ بہت خطرناک لگ رہے ہیں۔ شاید یہ ہمیں بھی اپنے تجربوں کی بھینٹ...“

”تم فکر مت کرو یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”وہ چاروں...“

”شش۔“ نواب صاحب نے آہستہ سے کہا۔ ”اس بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

نوشی خاموش ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب وہ چاروں ہی ان کی امید تھے۔ وہی انہیں یہاں سے نکال سکتے تھے۔ اگر وہ بھی پکڑے جاتے تو ان کی رہائی کی امید ختم ہو جاتی۔

☆☆☆

فولاد خان اور تیمور ان جھاڑیوں سے کچھ دور موجود تھے جن میں مسلح شخص موجود تھا۔ فولاد خان نے یقین سے کہا کہ وہ جھاڑیوں میں ہے کیونکہ وہ بہت معمولی سی حرکت کر رہا

تھا جس سے جھاڑیاں غیر فطری انداز میں ہل رہی تھیں۔ تیمور کو کیونکہ کسی قسم کا قبائلی تجربہ نہیں تھا اس لیے وہ دیکھنے سے قاصر رہا تھا۔ فولاد خان نے مزید دعویٰ کیا کہ وہ جھاڑیوں کے وسطی حصے میں ہے۔ اگر وہ اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے تو جھاڑیاں ہلنے سے وہ چوکنا ہو جاتا۔ تیمور نے کہا۔ ''اب اسے اپنے قبائلی طریقے سے قابو میں کرو۔''

فولاد خان سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ام کرسکتا اے پر خطرہ اے۔''

''وہ کیا؟''

جب فولاد خان نے قبائلی طریقہ بتایا تو تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس میں بہت خطرہ ہے۔''

''پر اس داؤس کو سامنے لانے کا یہ ای طریکا اے۔''

تیمور نے سوچا اور بادل ناخواستہ منظوری دے دی۔ وہ دونوں اوپر کی طرف بڑھے جہاں موٹے تنوں والے درخت تھے اور تیمور نے ایک مناسب جگہ پوزیشن لی۔ فولاد خان مزید آگے بڑھ گیا۔ وہ بڑی چٹان کے دوسری طرف گیا تھا۔ وہ بہت احتیاط سے حرکت کر رہے تھے کیونکہ ایک چھوٹا سا پتھر بھی سرک کر ان کی حرکت کا بھانڈا پھوڑ سکتا تھا۔ اس معاملے میں فولاد خان کسی چیتے کی طرح بے آواز تھا البتہ تیمور کو بہت سنبھل کر حرکت کرنا پڑ رہی تھی۔ فولاد خان نے چٹان کے عقب میں جا کر زمین سے مناسب سائز کے پتھر جمع کیے اور اس کے بعد انہیں یکے بعد دیگرے نیچے جھاڑیوں میں چھپے شخص پر برسانا شروع کر دیا۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تو نہیں تھا مگر چند ایک پتھر اس شخص تک پہنچ گئے اور وہ بوکھلا کر آڑ تلاش کرنے لگا۔ تقریباً سیر وزنی پتھر خاصی رفتار سے آ رہے تھے اور اسے لگتے تو وہ اچھا خاصا زخمی ہو سکتا تھا۔ پھر ایک پتھر اسے لگا بھی اور اس نے چلا کر گالی دی اور اس کے بعد اوپر کی طرف ایک برسٹ مارا لیکن تیمور اپنی جگہ اور فولاد خان پتھر کے پیچھے محفوظ تھے۔

برسٹ کے بعد فولاد خان کچھ دیر رکا۔ اس دوران میں وہ پتھر جمع کرتا رہا تھا جن کی یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ قدرتی طور پر گول اور بڑے آلو کے سائز کے پتھر اس کام کے لیے نہایت موزوں تھے۔ تیمور مسلح شخص کی حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اوپر کی طرف بڑھا مگر وہ اب بھی جھاڑیوں میں تھا اس لیے جب فولاد خان نے سنگ باری کا اگلا راؤنڈ شروع کیا تو اس نے بوکھلا کر درختوں تک آنے کی کوشش کی مگر وہ ابھی خاصا دور تھا۔ ایک بار پھر اسے پتھر لگا اور اس نے فولاد خان کی شان میں انگلش کے دریا بہا دیے۔ جواب آں غزل کے طور پر فولاد خان نے پشتو کا سہارا لیا اور اسے ان کلاسیک گالیوں سے نوازا جو صرف ایسے مواقع کے لیے مخصوص تھیں۔

اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ گورا اسے انگریزی میں نواز رہا ہے۔ فولاد خان چٹان کے پیچھے محفوظ تھا۔ اس لیے اس کا ہاتھ چلتا رہا۔ دوسرا پتھر کھا کر اس نے رائفل استعمال نہیں کی تھی بلکہ اب وہ چٹان پر نظر رکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ پتھر اسی سمت سے آ رہے تھے اس لیے اسے بچنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ یقیناً وہ فولاد خان کے سر میں سوراخ کرنے کا عزم لیے پیش قدمی کر رہا تھا اور اسی چکر میں وہ فراموش کر بیٹھا کہ یہاں اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ فولاد خان کا قبائلی منصوبہ یہی تھا۔ اسے ایک طرف لگا کر دوسری طرف سے غافل کیا جاتا اور پھر قابو کر لیا جاتا۔ اس لیے جیسے ہی وہ تیمور کی کمین گاہ تک پہنچا، اس نے کہا۔ ''ہالٹ۔''

مائیکل تربیت یافتہ شخص تھا اور لہجہ پہچانتا تھا اس لیے ساکت ہو گیا۔ تیمور نے اگلا حکم دیا۔ ''رائفل آگے پھینک دو۔''

اس نے اس بار بھی حکم کی تعمیل کی۔ تیمور اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے آیا تھا کہ مائیکل نے نہایت پھرتی سے بیٹھتے ہوئے لات گھمائی اور تیمور کوشش کے باوجود نہ بچ سکا۔ وہ گرا تو اس کے ہاتھ سے پستول نکل گیا اور مائیکل کا ہاتھ اپنی بیلٹ میں لگے پستول کی طرف گیا اور اس نے پستول نکال بھی لیا تھا مگر اسے استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ فولاد خان کی طرف سے چلایا ہوا پتھر اس کے سر پر لگا اور وہ تیورا کر گر گیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ گرنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ تیمور اٹھا تو اوپر سے ہانپتا ہوا فولاد خان آیا۔ اس نے تیزی سے بے ہوش مائیکل کی تلاشی لی اور اس کے سارے ہتھیار اپنے قبضے میں کر لیے۔ ان میں ایک عدد فوجی خنجر بھی تھا۔ پھر اس نے تیمور سے پوچھا۔

''آپ ٹھیک اے... ام نے اندازند مارا ہے؟''

''تم نے بروقت پتھر مارا ورنہ یہ مجھے گولی مار دیتا۔'' تیمور نے کہا اور اپنا پستول اٹھا لیا۔ فولاد خان نے مائیکل کی پشت پر موجود بیک پیک کی تلاشی لی اور اس میں موجود رسی نکال کر مائیکل کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ پتھر کی ضرب نے اس کا سر پھاڑ دیا تھا اور اس کے جلد ہوش میں آنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ تیمور نے تشویش سے

کہا۔ ''اسے ہوش نہیں آیا تو پھر ہم کس سے پوچھیں گے؟''

''اسی سے۔'' فولاد خان نے کہا۔ ''ام اس کو قبائلی طریقے سے بیدار کرتا اے۔''

اس بار تیمور اس کا قبائلی طریقہ دیکھ کر دنگ رہ گیا جب اس نے بے ہوش کے نتھنوں میں ایک ایک چٹکی نسوار ڈالی اور اس کا ردعمل بھی ہوا۔ ایک منٹ بعد اس نے حرکت شروع کی اور پھر چھینکیں مارتا ہوا ہوش میں آ گیا۔ اس نے کراہ کر اور بلبلا کر کہا۔ ''اوہ مائی گاڈ... واٹ از دس؟''

تیمور مسکرانے لگا۔ ''اسے قبائلی طریقہ کہتے ہیں۔'' مائیکل بیک وقت چھینک رہا تھا اور سر بھی جھٹک رہا تھا۔ بالآخر اس کی ناک سے نسوار خارج ہوئی تو اس کے حواس ٹھکانے آئے۔ وہ خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔ اس نے پھر پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

فولاد خان نے اسے نسوار کی ڈبیا ملاحظے کے لیے پیش کی جس پر شیشہ بھی لگا ہوا تھا۔ تیمور نے اسے آگاہ کیا۔ ''کچھ بائیولوجیکل تجربات ہم بھی کرتے ہیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے۔''

مائیکل اچھل پڑا۔ ''بائیولوجیکل... تم نے مجھے انفیکٹ کر دیا ہے؟''

''بالکل... اگر تم نے نہیں بتایا کہ ہمارے ساتھی کہاں لے جائے گئے ہیں تو تم اس آدمی سے بھی زیادہ اذیت ناک موت مرو گے۔ تمہاری لاش جلانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ مرنے کے بعد تم خود بہ خود جل کر راکھ ہو جاؤ گے۔''

نسوار نے مائیکل کی ناک کے اندرونی سسٹم کی جو حالت کی تھی اور وہ جیسی جلن محسوس کر رہا تھا، اس نے تیمور کی بے سروپا بات کا یقین کر لیا۔ فولاد خان کسی حد تک انگریزی سمجھ لیتا تھا، اس نے سر ہلایا۔ ''بس تم کو ایک خوراک اور دے گا۔''

تیمور نے ترجمہ کر کے دھمکی اس تک پہنچائی تو وہ بلبلا گیا۔ ''پلیز نہیں... خدا کے لیے۔''

''اس لیے پوچھے گئے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ تمہارے دونوں ساتھی میرے ساتھیوں کو کہاں لے گئے ہیں؟'' تیمور نے پوچھا۔ ''یاد رکھو، انہیں کچھ ہوا تو تم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔''

''وہ انہیں سائٹ پر لے گئے ہیں۔''

''سائٹ؟... کون سی سائٹ؟''

''اوپر ایک پرانی عمارت ہے۔'' مائیکل نے بتایا۔ ''ہم اسے سائٹ کہتے ہیں۔''

''تم تینوں اور مرنے والا شخص اسی عمارت سے آئے تھے؟''

''ہاں، وہ وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ ہمیں ہر صورت اسے مارنے اور اس کی لاش جلانے کا حکم ملا۔ وہ کسی مہلک وائرس سے انفیکٹ ہے جو کسی کو لگ جائے تو اسے موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ وہ بھی بس مرنے والا تھا، نہ جانے کیسے وہاں سے بھاگ نکلا۔''

''اسے یہ وائرس کیسے لگا؟'' تیمور نے اگلا سوال کیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ فولاد خان مائیکل کے پاس سے برآمد ہونے والا واکی ٹاکی الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس سے آواز آئی۔ ''مائیکل تم کہاں ہو؟''

☆☆☆

کرنل سوین جو کنٹرول روم میں ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف لگے کیمروں اور سینسرز پر نظر رکھتا تھا، اس نے جوناتھن کے کمرے میں جھانکا اور اطلاع دی۔ ''ایک اجنبی ریڈ ایریا میں ہے۔''

جوناتھن نے اپنے سامنے موجود کی بورڈ کا ایک بٹن دبایا اور کمپیوٹر مانیٹر پر سرویلنس کیمروں کی ویڈیو آنے لگی۔ ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے میں ایک شخص دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پستول سے مسلح تھا اور بہت چوکنے انداز میں آس پاس دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ شامی تھا۔ اسے دیکھتے ہی جوناتھن کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور اس نے کرنل سوین سے کہا۔ ''مائیکل کا معلوم کرو اور شکاری پھندے ایکٹو کر دو۔''

ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف زمین میں ایسے دھاتی شکنجے لگائے گئے تھے جو عام حالات میں بے ضرر ہوتے تھے اور کوئی ان پر پاؤں رکھ بھی دیتا تو اسے کچھ نہیں ہوتا تھا لیکن ایکٹو کیے جانے کے بعد جیسے ہی ان پھندوں پر کسی کا پاؤں آتا، یہ اس کا پیر پکڑ لیتے تھے۔ وہ دو اجنبیوں کو جو اتفاق سے وہاں آ نکلے تھے اسی طرح پکڑ کر اپنے تجربات کا نشانہ بنا چکے تھے۔ شامی بے خبری میں ایسے ہی ایک شکنجے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جوناتھن دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں کرنل سوین نے ایک اور تشویشناک اطلاع دی۔ ''میں مائیکل کو پکار رہا ہوں لیکن وہ جواب نہیں دے رہا۔''

''کارل اور جیسن کو بھیجو۔'' جوناتھن نے حکم دیا۔ ''لیکن ان سے کہو کہ اس شخص کو نہ چھیڑیں۔''

''میں سمجھ گیا۔'' کرنل سوین نے کہا۔ جوناتھن کی نظر

شامی پر مرکوز تھی۔ وہ شکنجے کے بالکل پاس پہنچ گیا تھا اور بس ایک قدم اور بڑھاتا تو اس کا پاؤں شکنجے میں ہوتا اور جکڑا جاتا۔ جوناتھن کو یقین تھا، یہ انہی چھ افراد میں سے ایک تھا جن میں سے دو پہلے ہی اس کے قبضے میں آچکے تھے۔ تیسرا یہ تھا اور باقی تین بھی جلد یا بدیر ان کے قبضے میں آجاتے۔ مگر اس مسلح شخص اور مائیکل کی خاموشی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ ابتدائی اطلاعات یہ تھیں کہ ان میں سے کوئی مسلح نہیں ہے۔ اس پریشانی کے باوجود اسے یقین تھا کہ باقی تین بھی جلد یہاں آئیں گے یا مارے جائیں گے اور اس کا پروجیکٹ ناکامی سے بچ جائے گا۔ اس کے بعد بہت سی دولت اس کی منتظر ہوگی۔ یہی نہیں وہ اس سے مزید پروجیکٹ حاصل کر سکے گا۔ اسے غرض نہیں تھی کہ ایسے پروجیکٹ میں انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ اسے ملنے والے رتبے اور دولت سے غرض تھی۔ آگے بڑھتا شامی رک گیا تو جوناتھن بے چین ہوگیا۔ اس نے زیرِ لب کہا۔ ”کم آن۔“

شامی نے پاؤں آگے بڑھایا اور شکنجے والی جگہ رکھ دیا۔

☆☆☆

کارل اور جیسن باہر آئے۔ شام کے چھ بج رہے تھے اور روشنی خاصی حد تک کم ہوگئی تھی مگر اتنی تھی کہ فی الحال سب نظر آرہا تھا۔ ویسے ان کے پاس تیز روشنی والی ٹارچ بھی تھیں۔ اگر ضرورت پڑتی تو وہ ان سے کام لے سکتے تھے۔ انہوں نے عقبی حصے سے کوئی تعرض نہیں کیا اور سیدھے ڈھلان پر نکل گئے۔ ریسٹ ہاؤس سے آگے نکلنے کے بعد انہوں نے ایک آلہ نکالا۔ یہ موبائل جیسا آلہ تھا جس کی چار انچ کی اسکرین پر تین نقطے نظر آرہے تھے۔ دو نقطے پاس پاس تھے۔ یہ کارل اور جیسن تھے۔ آلہ اصل میں واکی ٹاکی کی نشان دہی کر رہا تھا۔ تیسرا نقطہ جو ان سے خاصا دور تھا، وہ مائیکل تھا۔ کارل نے کہا۔ ”وہ تقریباً ایک کلومیٹر دور ہے۔“

جیسن نے منہ بنایا۔ ”اس پہاڑی علاقے میں اسے چار کلومیٹرز سمجھ لو۔“

”جانا تو ہے۔“ کارل نے کہا۔ ”ویسے میں ایسی جاب سے تنگ آگیا ہوں۔ یہ میرا آخری سال ہے، اس کے بعد میں ریٹائر ہوجاؤں گا۔“

”پھر کیا کروگے؟“

”میں نے خاصا کما لیا ہے۔ میں ایک موبائل ہوم خرید کر پورے ملک میں اور شاید ملک سے باہر بھی گھوموں گا۔“

”ہم خاندانی طور پر گھوڑوں کی پرورش کے ماہر ہیں۔ میں ایک فارم کھولوں گا۔ اس کام میں بہت دولت ہے۔“

وہ آنے والے حالات سے بے خبر مستقبل کے منصوبے بناتے ہوئے ڈھلان اترنے لگے۔ فاصلے سے لگ رہا تھا کہ انہیں سڑک کے پار دریا تک جانا پڑے گا۔ سڑک تک انہیں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ کارل جانتا تھا کہ اس علاقے میں کم سے کم تین افراد اور تھے۔ تیسرا فرد جو ریسٹ ہاؤس کے پاس پہنچ گیا تھا، انہیں اس سے تعرض نہ کرنے کا حکم ملا تھا۔ کرنل سوین کا کہنا تھا کہ اسے شکنجے کی مدد سے قابو کرلیا جائے گا۔ دریا کی طرف جاتے ہوئے جیسن نے کہا۔ ”ممکن ہے انہوں نے مائیکل کو قابو کرلیا ہو۔“

”ایک بار ہم پاس پہنچ جائیں تو پھر سب دیکھ لیں گے۔“ کارل نے آلے پر دیکھا۔ ”اب وہ چار سو گز کے فاصلے پر ہے۔“

اسی لمحے کارل کے کان میں لگے ہیڈسیٹ میں مائیکل کی تکلیف زدہ آواز آئی۔ ”ہیلو، کوئی مجھے سن رہا ہے؟“

”مائیکل! تم کہاں ہو؟ جواب کیوں نہیں دے رہے تھے؟“ کارل نے پوچھا۔ ”ہم تمہاری تلاش میں نکلے ہیں۔“

”میں دریا کے پاس ہوں، ایک گڑھے میں گر گیا ہوں۔ میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔“

”میرے خدا۔“ جیسن نے کہا۔ ”ہم آرہے ہیں۔ تم فکر مت کرو۔ ہمارے پاس لوکیٹر ہیں، تم کو تلاش کرلیں گے۔“

”اس طرف۔“ کارل نے لوکیٹر پر دیکھ کر ایک طرف اشارہ کیا۔ یہاں ڈھلان کم تھی اور درخت بھی کم ہونا شروع ہوگئے تھے۔ یہاں زمین پر جھاڑیاں اور بڑے پتوں والے پودے تھے۔ اب وہ مائیکل سے تین سو گز کے فاصلے پر تھے۔ کارل اور جیسن پوری طرح ہوشیار تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں تھام لی تھیں۔ اگرچہ مائیکل نے انہیں اپنے بارے میں بتایا تھا مگر وہ طریقۂ کار کے مطابق آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں تربیت دی گئی تھی کہ ہنگامی حالات میں صرف اپنی آنکھوں اور کانوں پر اعتبار کریں۔ کارل نے مائیکل سے پوچھا۔ ”ان لوگوں کا کوئی سراغ ملا؟“

”نہیں، میں تو تمہارے جانے کے بعد اس مصیبت

میں پڑ گیا۔“

”تیسرا بھی پکڑا گیا ہے۔“ کارل نے اسے آگاہ کیا۔ ”وہ خود آفس تک پہنچ گیا۔ اب تین باقی ہیں۔“

”جلدی آؤ، میں بہت تکلیف میں ہوں۔“

”ہم بس پہنچ گئے ہیں۔“

☆☆☆

جوجی ایک درخت کے تنے کے ساتھ دبکا ہوا تھا۔ اس نے شامی کو ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا مگر وہ ہمت کرکے اپنی جگہ ڈٹا ہوا تھا۔ اچانک ہی زمین سے اسی جگہ سے اسے دو افراد نکلتے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک تو وہی تھا جو نواب صاحب اور نوشی کو ہینڈز اپ کرا کے لایا تھا، دوسرا جوجی نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس پراسرار جگہ اور کتنے غیر ملکی ہیں۔ انہوں نے فلمی اسٹائل کا کمانڈو لباس پہن رکھا تھا جس کا زیادہ تر حصہ سیاہ تھا۔ باہر آکر وہ نیچے کی طرف روانہ ہوئے۔ نیچے جاتے ہوئے وہ آپس میں بات کرتے ہوئے جوجی کے بالکل پاس سے ہی گزر رہے تھے۔ وہ چیڑ کے اس بڑے تنے سے چپکا کھڑا تھا اور اس خوف سے حرکت بھی نہیں کی کہ وہ آہٹ نہ سن لیں۔ اگر وہ پلٹ کر دیکھتے تو جوجی سامنے ہی تھا مگر اس کی قسمت کہ انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

جب وہ خاصے آگے نکل گئے تو جوجی نے رکا ہوا سانس لیا۔ جب وہ اس کے پاس سے گزرے تو ان کی گفتگو سے لگا کہ وہ اپنے ساتھی کو تلاش کرنے جا رہے تھے۔ یہ یقیناً وہی تھا جسے وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ جوجی کو امید ہوئی کہ تیمور اور فولاد خان نے اسے قابو کرلیا ہوگا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ ان لوگوں نے اس ایک آدمی کو قابو کرلیا ہوگا مگر وہ ان دو کی آمد سے بے خبر رہیں گے اور ایسا نہ ہو بے خبری میں مارے جائیں۔ جوجی مضطرب ہوگیا۔ اس نے پلٹ کر ریسٹ ہاؤس کی عمارت کی طرف دیکھا۔ شامی نظر نہیں آرہا تھا اور اس کے پاس وقت بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی شامی نے اسے اپنے پیچھے آنے سے منع کیا تھا۔ اس لیے جوجی ان کے پیچھے چل پڑا۔ وہ ان سے تقریباً سو گز پیچھے تھا اور بہت احتیاط سے چل رہا تھا کہ کوئی ایسی آہٹ یا آواز نہ ہو جو وہ سن لیں۔ اگر وہ اسے دیکھ لیتے تو آرام سے پکڑ لیتے یا مار دیتے۔ کچھ دیر میں انہوں نے سڑک کراس کی اور ڈھلان کے دوسری طرف قدم رکھا۔

نازک اندام جوجی کے لیے آج کا دن زیادہ ہی سخت ثابت ہوا تھا۔ ڈھلانوں پر چڑھ اور اتر کر اس کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہیں کہیں لیٹ جائے۔ بلندی کی وجہ سے آکسیجن کم ہونے سے بھی تھکن زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اس وقت رکنے کا مطلب تھا کہ اس سمیت سب مارے جاتے یا پکڑے جاتے۔ جوجی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کون لوگ تھے مگر وہ اس شخص کا حشر دیکھ چکا تھا جو سڑک پر اچانک ان کے سامنے آیا تھا اور کتنے اذیت ناک انداز میں مرا تھا۔ وہ دونوں رک رک کر چل رہے تھے اس لیے جوجی ان کے پاس ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے پہلے سے دیکھے شخص کو کسی سے بات کرتے سنا۔ اس کا مخاطب اس کا ساتھی نہیں تھا بلکہ وہ واکی ٹاکی سے منسلک ہیڈسیٹ پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

اچانک جوجی کو ایک خیال آیا اور اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اگر وہ اس آدمی سے بات کر رہا تھا جو پیچھے رہ گیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ ٹھیک تھا۔ البتہ تیمور اور فولاد خان کی خیریت مشکوک ہوگئی تھی۔ بات کرکے وہ نیچے کی طرف روانہ ہوئے اور اب انہوں نے اپنی گنیں بہت چوکنا انداز میں تھام رکھی تھیں۔ جوجی خاموشی سے ان کے پیچھے تھا۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھا۔ پھر اسے شامی کی بات یاد آئی تو اس نے زمین سے مناسب سائز کے پتھر اٹھا لیے۔ کچھ ہاتھ میں پکڑے اور کچھ ٹراؤزر کی جیبوں میں ڈال لیے۔ ان دونوں کے انداز سے لگا جیسے وہ کسی خاص جگہ کے پاس ہوں۔ جوجی کی نظریں بے تابی سے تیمور یا فولاد خان کو کھوج رہی تھیں مگر وہ سامنے کہیں نہیں تھے۔ وہ دونوں اب جھاڑیوں میں تھے۔ ان میں نیا والا آگے تھا اور پہلے والا پیچھے۔ اچانک آگے والا الٹ کر گرا اور پھر الٹا ہوا میں بلند ہوتا چلا گیا۔ پیچھے والے نے بوکھلا کر سامنے کی طرف جھاڑیوں میں برسٹ مارا۔

☆☆☆

فولاد خان نے عقل مندی کی اور واکی ٹاکی کا کوئی بٹن دبانے کے بجائے اسے تیمور کی طرف بڑھا دیا۔ تیمور نے اس کا معائنہ کیا۔ جواب دینے کے لیے ایک بٹن دبانا پڑتا۔ اس نے فولاد خان کی طرف دیکھا اور فکرمندی سے بولا۔ ”اب وہ لوگ اس کی تلاش کریں گے۔“

فولاد خان خوش ہوگیا۔ ”یہ تو اچا اے۔ ادر قبائلی جنگ میں دشمن کو ادر بلاتا اے جدر ام اس پر کابو پالے۔ اب ام کو دشمن کے پاس نئیں جانا پڑے گا۔“

”فرض کرو کہ دشمن ادھر آ گیا... مطلب اسے تلاش کرتے ہوئے تین چار بندے اور آ گئے تو... تمہارے پاس ان سے نمٹنے کا کوئی قبائلی طریقہ ہے؟“

فولاد خان نے سر کھجایا۔ ”قبائلی طریقہ اے پر وہ امارا نئیں اے۔“

”مطلب؟“

”ریڈ انڈین قبائل کا اے۔ پر ام کو آتا اے۔“

”تو یار استعمال کرو نا، اب سمجھو تمہارا طریقہ ہے۔“

فولاد خان فوری حرکت میں آ گیا۔ رسی کا بنڈل انہیں مائیکل کے پاس سے مل گیا تھا۔ اس کی بیک کٹ میں بہت سی کام کی چیزیں تھیں۔ فولاد خان نے اسی سے کام لیا۔ بیس منٹ سے بھی کم وقت میں اس نے کام مکمل کر لیا اور تیمور سے کہا۔ ”اب دشمن کو بلاؤ۔“

تیمور مائیکل کے پاس آیا، اس کی حالت بہتر ہوئی تھی۔ اس لیے جب تیمور نے اسے بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے تو وہ ہچکچایا مگر فولاد خان نے ڈبیا کھول کر اسے نسوار کا دیدار کرایا تو وہ فوراً راضی ہو گیا۔ تیمور نے واکی ٹاکی اس کے منہ کے پاس کیا اور وائس کا بٹن دبایا۔ اس نے پہلے ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کہنا تھا اور کیا نہیں کہنا تھا۔ جو بات نہیں کہنی تھی اگر وہ کہتا تو فوراً فوت ہو جاتا۔ مائیکل اپنے ساتھیوں کو پکارنے لگا۔ فوراً جواب ملا اور تیمور نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے بروقت قدم اٹھا لیا۔ اسے پتا چل گیا کہ آنے والوں کے پاس لوکیٹر ہے۔ اس نے فوری فولاد خان سے مشورہ کیا اور ایک حکمتِ عملی طے کر لی۔ فولاد خان ایک طرف چھپ گیا اور تیمور مائیکل کے ساتھ تھا۔ واکی ٹاکی اس نے اپنے قبضے میں رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد اوپر سے دو مسلح افراد برآمد ہوئے۔ وہ ان کی طرف ہی آ رہے تھے۔ لوکیٹر کی وجہ سے انہیں آسانی ہوئی تھی اور اب وہ ان کی مرضی کے مطابق اسی طرف آتے جہاں فولاد خان نے جال بچھایا تھا۔ ایک جانا پہچانا تھا اور وہ پیچھے تھے۔ دوسرا پہلی بار نظر آیا تھا اور وہ آگے تھا۔ اس نے اپنی رائفل یوں تھام رکھی تھی کہ ایک سیکنڈ کے نوٹس پر فائر کر سکے۔

پھر آگے والے کا پاؤں ٹریپ سے ٹکرایا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تو اوپر قوت سے کھینچی ہوئی شاخ آزاد ہو گئی۔ وہ سیدھی ہو کر فضا میں بلند ہوئی تو اس سے بندھی رسی کا پھندا کھنچا۔ وہ آگے والے کے پاؤں میں آیا اور پھر کھنچتا ہوا اور سمٹتا ہوا اسے بھی اٹھا کر لے گیا۔ وہ الٹ کر گرا تو اس کی اپنی رائفل کا دستہ اس کے منہ پر لگا۔ پیچھے والے نے منطقی طور پر سامنے کی سمت برسٹ مارا۔ اسے عقب کا خیال نہیں رہا تھا۔ فولاد خان نے پیچھے سے اس کا سر پتھر سے بجایا۔ وہ چوٹ کھا کر گرا۔ فولاد خان نے دوسری ضرب لگائی تو وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس دوران میں الٹے لٹکے جیسن نے کسی طرح اپنی رائفل پکڑ لی تھی اور اس کا رخ فولاد خان کی طرف کیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا جوجی فولاد خان کو لیتا ہوا نیچے گرا اور وہ دونوں ایک درخت کی آڑ میں چلے گئے۔ جیسن نے برسٹ مارا مگر گولیاں عقب میں زمین اور درختوں کو لگیں۔

”بس۔“ عقب سے تیمور نے اسے للکارا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ فولاد خان اور جوجی محفوظ رہے تھے۔ ”رائفل پھینک دو ورنہ تمہارے سر میں سوراخ کر دوں گا۔“

جیسن نے صورتِ حال محسوس کرتے ہوئے رائفل پھینک دی۔ فولاد خان نے اپنی جگہ سے اٹھ کر فوری طور پر جیسن اور کارل کی تلاشی لی اور ان کا تمام اسلحہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس دوران میں تیمور جوجی سے اس کی آمد کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ ”تم کیسے اچانک آ گئے اور شامی کہاں ہے؟“

”وہ اوپر اس جگہ ہیں جہاں ان لوگوں کا ٹھکانا ہے۔ میں ذرا پیچھے تھا اور میں نے ان لوگوں کو نکل کر نیچے آتے دیکھا۔ مجھے لگا کہ یہ آپ کی تلاش میں ہیں۔ میں آپ لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے ان کے پیچھے آیا تھا۔“

تیمور نے جوجی کا شانہ تھپکا۔ وہ یہ سن کر پریشان ہو گیا تھا کہ نواب صاحب اور نوشی کو اس تجربہ گاہ میں لے جایا گیا تھا جہاں سے مرنے والا شخص نکل بھاگا تھا۔ تلاشی لے کر فولاد خان نے ان دونوں کو بھی باندھ دیا اور ذرا دیر بعد وہ تینوں ایک ہی صف میں پڑے ہوئے تھے۔ کارل کو ہوش میں لانے کا قبائلی طریقہ اس بار بھی موثر رہا تھا۔ البتہ کارل کی ناک زیادہ نازک ثابت ہوئی تھی۔ وہ سرخ ہو گئی تھی اور اس سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔ ان کی رسی سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے تھے اور ان کی ساری چیزیں انہوں نے قبضے میں لے لی تھیں۔ خاصے اسلحے کے ساتھ ان کے پاس سے واکی ٹاکی اور ان کے ہیڈ سیٹ بھی ملے تھے۔ تیمور نے تینوں واکی ٹاکی آف کر دیے ورنہ وہ لوکیٹر پر آ سکتے تھے۔ تیمور نے ان کی طرف دیکھا۔ ”اب ذرا بات کر لی جائے اور مجھے اپنے ہر سوال کا جواب چاہیے۔“

فولاد خان نے خوفناک انداز میں نسوار کی ڈبیا لہرائی۔ ”ورنہ امارے پاس یہ اے، تو مارا باپ بی بولے گا۔“

☆☆☆

شامی نے زمین پر پاؤں رکھا اور پھر ایک دوسرا قدم اٹھاتا ہوا ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے عقب میں واقع اس دروازے تک آیا۔ زمین سے چار فٹ اونچے اس چبوترے پر چھوٹا سا چھجا بنا ہوا تھا اور اس کے تلے دروازہ تھا مگر اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے کھلے شاید نصف صدی گزر چکی تھی۔ بارش اور نمی کی وجہ سے پھول جانے والا دروازہ اب چوکھٹ کا ایک حصہ بن گیا تھا اور اسے نارمل طریقے سے کسی صورت نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ صرف توڑا جا سکتا تھا۔ شامی کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ خطرہ بہت بڑا ہے اور وہ اکیلا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن وہ واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اسے نواب صاحب اور نوشی کی فکر تھی۔ وہ اندر تھے اور نہ جانے ان پر کیا گزر رہی تھی۔ شامی کو رہ رہ کر اس شخص کا خیال آ رہا تھا جو گاڑی کے سامنے آیا تھا اور بہت اذیت ناک انداز میں مرا تھا۔

اندر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ خفیہ راستے سے اندر جا نہیں سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس راستے کی نگرانی کی جاتی ہوگی اور جیسے ہی کوئی یہاں آتا ہوگا، اندر والوں کو اس کا پتا چل جاتا ہوگا۔ تبھی خفیہ راستہ خود بہ خود کھل گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اندر نہیں جا سکتا تو اندر والوں کو باہر نکالا جا سکتا ہے... مگر کیسے؟ یہاں ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے ساتھ اگ آنے والی بے شمار جھاڑیاں جو اپنی عمر پوری کر کے ..... سوکھ گئی تھیں، ان کا ڈھیر موجود تھا۔ عمارت پتھر کی بنی تھی۔ اچانک شامی کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اگرچہ اس میں رسک تھا لیکن وہ اندر جائے بغیر بھی اندر والوں کو باہر آنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ اس نے آس پاس سے سوکھی گھاس دیوار کے ساتھ موجود جھاڑیوں تلے جمع کی اور لائٹر نکال کر اسے آگ دکھا دی۔ سوکھی گھاس جلی اور اس نے جھاڑیوں کو آگ لگا دی۔ ایک منٹ سے بھی پہلے خشک جھاڑیاں دھڑا دھڑ جلنے لگیں اور آگ شامی کے اندازے سے بھی زیادہ تیزی سے پھیل رہی تھی۔

☆☆☆

جوناتھن نے بے یقینی سے اسکرین کی طرف دیکھا۔ کچھ نہیں ہوا تھا۔ شکنجے نے اپنا کام نہیں کیا تھا اور آنے والے کا پاؤں صحیح سلامت تھا۔ اس نے فوری کرنل سوین کو کال کی۔ ”شکنجے نے کام نہیں کیا ہے۔ فوراً اپنے آدمی بھیجو۔ لیکن خیال رہے، وہ مسلح ہے۔“

"ممکن ہے کوئی مسئلہ ہوا ہو۔" کرنل سوین نے جواب دیا۔ "اب میرے پاس صرف رائے ہے۔"

"تم دونوں باہر جاؤ۔" جوناتھن نے کہتے ہوئے اسکرین کی طرف دیکھا اور چلّایا۔ "جلدی کرو، وہ جھاڑیوں کو آگ لگا رہا ہے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے اسکرین پر شعلے نظر آنے لگے۔ بدقسمتی سے ریسٹ ہاؤس کے ساتھ ان جھاڑیوں کا ڈھیر تھا جنہیں صرف اس لیے صاف نہیں کیا گیا تھا کہ اس طرح یہ عمارت فطری طور پر غیر آباد نظر آئے گی مگر یہی جھاڑیاں اب ان کے گلے پڑنے والی تھیں۔ کرنل سوین اور رائے مسلح ہو کر تیزی سے باہر نکلے۔ جوناتھن کی پریشانی اب چہرے سے جھلک رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس معاملے کو اس نے کچھ زیادہ ہی ہلکا لیا تھا اور نتیجہ یہ نکلا تھا۔ اگرچہ ان لوگوں سے نمٹ کر آگ بجھائی جاسکتی تھی۔ ان کے پاس انتظام تھا مگر اسے خدشہ تھا کہ اٹھنے والا دھواں کسی کو متوجہ نہ کرلے۔ ابھی ان چھ کو ٹھکانے لگانا تھا اور پھر ان کی گاڑیوں کو بھی غائب کرنا تھا۔ کام بہت زیادہ تھا۔ اسے کارل اور جیسن کا خیال آیا۔ خاصی دیر سے ان کی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اس نے واکی ٹاکی پر انہیں پکارا۔

"کارل... جیسن! کہاں ہو تم؟"

مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ جوناتھن کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا، اس طرف بھی کوئی مسئلہ ہوگیا تھا۔ شاید آج اس کے لیے مسائل کا دن تھا۔ اس نے اپنی میز کی دراز کھولی اور اس میں موجود پستول نکال لیا۔ اسکرین پر اب شعلے ہی شعلے نظر آرہے تھے اور آگ لگانے والا غائب ہوگیا تھا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور اس کے ایک ماتحت نے بدحواسی میں اطلاع دی۔ "سر! ایک طرف کا فائبر پگھل رہا ہے اور دھواں اندر آرہا ہے۔"

جوناتھن اٹھ کر دوڑا۔ جس طرح باہر آگ لگی ہوئی تھی، اس طرف کی فائبر دیوار اور ایلومینیم شیٹ جل گئی تھی اور دھواں اندر آرہا تھا۔ جوناتھن نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ "یہاں پنکھے لگاؤ، دھواں اندر آنے سے روکو۔"

ان کو حکم دے کر وہ ایک لیب جیسے حصے میں آیا۔ یہاں اس نے شیشے کے دروازے کے ساتھ لگے پینل پر نمبر دبائے تو دروازہ کھل گیا۔ اندر ایک درمیانے سائز کا فریج رکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے کھولا اور اندر موجود نیلے اور سبز انجکشنز کے سیٹ نکال کر ایک مخصوص بریف کیس میں رکھنے لگا۔ یہ بریف کیس خاص طور سے ان کو رکھنے کے لیے ہی بنا تھا۔ پھر اس نے آفس میں آکر اپنے کمپیوٹر سے ایک یو ایس بی لگائی اور کمپیوٹر میں موجود ڈیٹا اس میں منتقل کرنے لگا۔ یہ ڈیٹا اس سارے پروجیکٹ کا نچوڑ تھا۔ تجربات کا آخری دور چل رہا تھا اور ان تجربات کا نشانہ چھ افراد تھے۔ یہ سب مقامی تھے اور ان میں سے ایک فرار میں کامیاب رہا تھا مگر وہ موت سے نہیں بچ سکا تھا۔ باقی پانچ بھی مرچکے تھے۔ اگر یہ آگ بجھائی نہیں جاتی تو یہ عمارت اور اس میں موجود تجربہ گاہ خود بہ خود جل کر تباہ ہوجاتی۔ پھر اس میں ایسے آتش گیر مادے موجود تھے جو تمام عمارت کو پوری طرح بھسم کردیتے اور یہاں سے وائرس پھیلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہتا۔ ان لوگوں سے نمٹ کر وہ یہاں سے چلے جاتے۔ جیسے ہی ڈیٹا منتقل ہوا، اس نے یو ایس بی نکال لی اور پھر واکی ٹاکی پر رائنا کو پکارا۔ دوسری بار پکارنے پر بھی کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

رائنا اس وقت باورچی عبدل کے ساتھ تھی۔ عبدل سانولے رنگ کا اور کسی قدر پھولے منہ والا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ بہ ظاہر وہ سست اور عام سا باورچی نظر آتا تھا مگر درحقیقت وہ نہ سست تھا اور نہ باورچی تھا۔ اسے رائنا یہاں لائی تھی۔ اس کا اصل نام سریش گریشور تھا۔ جیسے رائنا کا اصل نام رینا تھا۔ وہ اس جنگ زدہ ملک میں اپنے ملک کے خاص نمائندے تھے اور انہیں اسی پروجیکٹ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ رینا نے کامیابی سے جوناتھن کو اپنی مٹھی میں کیا تھا۔ اس نے خود کو اسی جنگ زدہ ملک کا ظاہر کیا تھا۔ پھر وہ سریش کو عبدل بنا کر لے آئی۔ اس نے اسے اپنا رشتے دار ظاہر کیا تھا۔ اس نے جوناتھن کو یہی بتایا تھا کہ اس کا پورا خاندان گاؤں پر ہونے والی بمباری میں مارا گیا تھا۔ یوں اس کی کہانی کی تردید کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی جوناتھن باس تھا اور وہ اس سے مطمئن تھا اس لیے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ اگرچہ یہ سیکیورٹی کے حوالے سے غیر ذمے داری تھی۔ شاید پروجیکٹ کی نوعیت کی وجہ سے اس کی معمول کی سیکیورٹی انسپکشن نہیں ہوئی تھی۔

سریش بائیولوجی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور وہ یہاں ہونے والے کاموں کی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ اس جگہ دواؤں یا بائیولوجیکل مواد کا تجربہ نہیں ہوتا تھا بلکہ پہلے سے تیار مواد آتا تھا اور اس کے انسانوں پر تجربات کیے جاتے تھے۔ گزشتہ تین سال کے عرصے میں جوناتھن اور اس کی ٹیم نے تقریباً سو انسانوں کو اپنے تجربات کا نشانہ بنایا تھا۔ ان میں سے

اکثر تو اسی جنگ زدہ ملک سے تعلق رکھتے تھے جہاں سے جوناتھن رینا کو ساتھ لایا تھا۔ رینا وہاں کی زبان روانی سے بولتی تھی اور مقامی رسم و رواج سے اچھی طرح واقف تھی اس لیے اسے اپنا کام کرنے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ جن لوگوں پر بائیولوجیکل ہتھیاروں کا تجربہ کیا جاتا تھا' جب وہ مرجاتے تو ان کی لاشیں اسی عمارت میں موجود ایک جدید ترین کیمیائی بھٹی میں ڈال کر اس طرح جلائی جاتی تھیں کہ ان کی راکھ بھی بہت کم بچتی تھی اور اس راکھ کو بہ آسانی جنگل میں ٹھکانے لگا دیا جاتا تھا۔

رینا اور سریش جانتے تھے کہ مخصوص کیمیائی اور بائیولوجیکل مواد کے تجربات تقریباً مکمل ہوگئے تھے۔ مواد بائیولوجیکل اور کیمیاوی دونوں خصوصیات رکھتا تھا۔ بائیولوجیکل ہتھیار بہت مہلک ہوتے ہیں مگر ایک بار کھلی فضا میں آنے کے بعد اگر ان کو نشانہ بنانے کے لیے انسان نہ ملیں تو یہ کچھ ہی دیر میں بیکار ہوجاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں کیمیاوی ہتھیار مہلک ہوتے ہیں اور بہت دنوں تک اپنی ہلاکت خیزی بھی برقرار رکھتے ہیں مگر یہ پھیلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے جو بائیولوجیکل ہتھیاروں میں ہوتی ہے کیونکہ یہ اصل میں مہلک وائرس ہوتے ہیں۔ اس نئے ہتھیار میں دونوں خصوصیات شامل کردی گئی تھیں۔ مہلک جرثوموں کو ایسی خصوصیات دی گئی تھیں کہ وہ بہت عرصے تک کارآمد رہتے اور ان کا توڑ مشکل تھا۔ مگر جس ملک نے انہیں تیار کیا تھا، اس نے ان کا توڑ بھی کرلیا تھا۔ جوناتھن نے فریج سے انجکشنوں کے جو سیٹ نکالے تھے، ان میں نیلا مواد ہلاکت خیز وائرس پر مشتمل تھا جبکہ سبز مواد اس کا توڑ تھا۔

رینا اور عبدل اس بات سے واقف تھے۔ وہ بہت سکون سے کام کررہے تھے اور انہوں نے کسی کو شک کا موقع دیے بغیر اس پروجیکٹ کی تقریباً تمام اہم معلومات حاصل کرلی تھیں مگر وہ اس مخصوص مواد تک رسائی حاصل نہیں کرسکے تھے کیونکہ وہ صرف جوناتھن کی رسائی میں تھا۔ آخری بار جب رینا نے باہر جانے پر اپنے اوپر والوں سے رابطہ کیا تھا تو انہوں نے اسے حکم دیا کہ وہ بہر صورت یہ مواد اور اس کا توڑ حاصل کرے۔ یہاں موجود تمام افراد کو اس کے توڑ کے انجکشن پہلے ہی لگا دیے گئے تھے۔ ایک بار لگانے کے بعد یہ انجکشن ایک سال تک موثر رہتا تھا۔ جب رینا کو حکم ملا تو اس نے سریش کے ساتھ مل کر پلان بنایا۔ انہیں بہر صورت یہ مواد حاصل کرنا تھا۔ انہیں معلوم تھا، عام حالات میں یہ کام نہیں ہوسکے گا۔ اس لیے انہوں نے تہ خانے میں موجود تجربے کے شکار افراد میں سے ایک نوجوان کو وہاں سے فرار کرا دیا۔ اس دوران میں رینا نے سیکیورٹی سسٹم آف کردیا اور کسی کو پتا نہیں چلا کہ ایک آدمی فرار ہوگیا ہے۔

رینا اور سریش کا خیال تھا کہ ایک آدمی کے فرار سے وہاں افراتفری پھیلے گی اور وہ اس کا فائدہ اٹھا کر اپنے مطلب کی چیز حاصل کریں گے اور یہاں سے فرار ہوجائیں گے۔ ان کے لوگ باہر مدد کے لیے موجود ہوتے اور وہ بہ آسانی واپس اپنے ملک پہنچ جاتے۔ دوسرے رینا اور سریش کے ذہن میں یہ شیطانی خیال آیا تھا کہ ایک متاثرہ آدمی آزاد ہوگا اور وہ دوسروں کو بھی یہ وائرس لگا دے گا۔ اس ملک میں کیا، ساری دنیا میں اس کا کوئی توڑ نہیں تھا، سوائے اس سبز مواد کے جو اسی ملک نے بنایا تھا جس نے یہ مہلک ہتھیار تیار کیا تھا۔ رینا اور سریش کا ملک اس ملک کا دشمن تھا اور وہ اسے تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کررہا تھا۔ اسی مقصد کے تحت وہ اپنے ہاں ہتھیاروں کا انبار لگا رہا تھا اور ساری دنیا سے جدید جنگی اسلحہ خریدنے کے ساتھ ساتھ وہ چوری چھپے کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار بھی تیار کررہا تھا۔ اس کے ایجنٹ ساری دنیا میں ایسے خفیہ پروجیکٹس تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے جہاں مہلک کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار تیار ہوتے تھے۔ اس کے لیے اس ملک نے اپنی خفیہ ایجنسی کا ایک خصوصی شعبہ بنایا تھا۔ رینا اور سریش اسی شعبے کے ایجنٹس تھے۔

مگر ان کی سازش اس حد تک ناکام رہی کہ جوناتھن کو جلد پتا چل گیا کہ ایک وائرس زدہ شخص باہر نکل گیا ہے۔ پھر باہر نکلنے والا مرگیا اور اس کے پیچھے جانے والوں نے اس کی لاش جلا دی۔ البتہ اس وجہ سے یہاں افراتفری ضرور پھیل رہی تھی۔ باہر جانے والے ان کے تین اہم افراد غائب تھے۔ ایک زخمی تھا اور اب ریسٹ ہاؤس کے پاس آگ بھی لگ گئی تھی۔ رینا کے خیال میں یہی موقع تھا حرکت میں آنے کا۔ وہ جوناتھن کی نگرانی کررہی تھی۔ جیسے ہی جوناتھن گلاس روم سے سامان لے کر کمرے میں گیا، رینا حرکت میں آگئی۔ پہلے وہ سریش کے پاس گئی اور اسے سمجھا کر جوناتھن کے پاس آئی۔ وہ اس وقت بریف کیس کھول کر اسے دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ رینا کی آمد پر اس نے ناگواری سے کہا۔

"پوچھے بغیر کیوں آئی ہو...." وہ کہتے ہوئے رک گیا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک عجیب وضع کا پستول نما آلہ تھا مگر یہ پستول نہیں تھا۔ رینا نے

اس کا ٹریگر دبایا تو اس سے دھواں سا نکل کر بہت سرعت سے جوناتھن کے چہرے سے ٹکرایا اور اسے شدید جھٹکا لگا۔ اسی لمحے باہر سے خودکار رائفل کی آواز آئی۔ یہ سریش تھا جو باقی سب کو ختم کر رہا تھا۔ دھواں لگتے ہی جوناتھن نے چیخ مار کر دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے تھے اور اب بھی مسلسل چیخ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے منہ پر دھواں نہیں بلکہ تیزاب لگا ہو۔ رینا نے اطمینان سے بریف کیس بند کیا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ مگر وہ دیکھ نہیں سکی تھی کہ جوناتھن کے ہاتھ میں نیلے مواد والی شیشی تھی اور وہ اس کے ہاتھ سے نیچے گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے کمرے میں بزر گونجنے لگا۔ رینا چونکی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکی اور اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ لاک تھا۔ بزر مسلسل گونج رہا تھا۔ رینا واپس آئی اور جوناتھن کے سامنے رکھا ہوا کی بورڈ اپنی طرف کر کے اس پر انگلیاں چلانے لگی۔ وہ خطرے کے الارم کو ڈی ایکٹی ویٹ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ الارم بجتے ہی متعلقہ حصہ سیل ہو جاتا۔ وہ اس نظام سے اچھی طرح واقف تھی اور جانتی تھی کہ دروازہ کھلوانے کے لیے ضروری تھا کہ الارم بند کیا جائے۔ جوناتھن اب گالیاں دے رہا تھا۔ رینا نے چلا کر کہا۔

''شٹ اپ... الارم ڈی ایکٹی ویٹ کرو۔''

جوناتھن رونے کے انداز میں کراہا۔ ''یہ نہیں ہوگا کیونکہ یہاں وائرس موجود ہے۔''

''ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' رینا بولی۔ ''ہم نے اس کا توڑ لیا ہوا ہے۔''

''مجھے نہیں پڑے گا۔'' جوناتھن اب خاموش تھا۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ اس کے چہرے پر آبلے سے ابھر آئے تھے اور سوجن کی وجہ سے آنکھیں بند تھیں۔ ذرا سی دیر میں اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ بہ ظاہر معمولی سے نظر آنے والے دھویں نے اس کا یہ حال کیا تھا، یقیناً یہ بھی کوئی کیمیائی ہتھیار تھا۔ یعنی اس کا جوتا اسی کے سر پر پڑا تھا۔

رینا چونکی۔ ''کیا مطلب؟''

''تمہیں جو توڑ دیا گیا تھا، وہ چھ مہینے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے تم اب محفوظ نہیں ہو۔ جو توڑ ہم نے لیا ہے، وہ ایک سال کا ہے۔''

رینا نے گھبرا کر اپنا معائنہ کیا۔ مگر فی الحال کوئی علامت نہیں تھی۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

مگر رینا نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر پستول نما آلہ اٹھایا اور سفاک لہجے میں بولی۔ ''اسے ڈی ایکٹی ویٹ کرو یا اذیت ناک موت مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس بار تم بچو گے نہیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔ باہر آگ لگی ہے اور یہاں اندر الارم بج گیا ہے اس لیے سب سیل ہو گیا ہوگا۔ اب کوئی باہر نہیں جا سکے گا اور نہ کوئی اندر آسکے گا۔''

''ذلیل کتے۔'' رینا نے غصے سے کہا اور پھر ٹریگر دبایا۔ ایک بار پھر اس سے دھواں نکل کر جوناتھن سے ٹکرایا اور اس کے حلق سے اذیت بھری چیخ نکلی۔ اسی لمحے رینا نے دیکھا، اس کے ہاتھ پر زخم نمودار ہو رہے تھے۔ اس نے متوحش ہو کر مانیٹر کو آف کر کے اس کی چمک دار اسکرین پر اپنی صورت دیکھی اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے منہ پر چھوٹے چھوٹے چھالے نمودار ہو رہے تھے۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی۔ جوناتھن نے سچ کہا تھا۔ ان لوگوں کو چھ مہینے بچانے والا انجکشن دیا گیا تھا۔ پھر اس نے چلا کر سریش کو آواز دی اور دروازے کا شیشہ بجانے لگی۔ اس کی آواز باہر نہیں گئی تھی مگر جب اس نے شیشہ بجایا تو فوراً ہی سریش نمودار ہوا۔ اس نے تشویش سے رینا کو دیکھا اور اشارے سے پیچھے ہٹنے کو کہا۔ وہ پیچھے ہٹی تو سریش نے خودکار رائفل کا رخ دروازے کی طرف کیا۔ اس نے برسٹ مارا اور پھر خود نیچے گر گیا۔ اسے یا رینا کو علم نہیں تھا کہ یہ بلیٹ پروف شیشہ ہے۔ گولیاں پلٹ کر سریش کے پیٹ میں گھس گئی تھیں۔ اب وہ جان کنی کی کیفیت میں ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ رینا کے عقب میں جوناتھن رونے کے انداز میں ہنس رہا تھا۔ اس کی آواز میں دیوانگی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے تکلیف نے اسے پاگل کر دیا ہے۔ رینا دانت پیستی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور پستول نما آلہ اس کی طرف کر دیا۔

☆☆☆

شامی آگ لگاتے ہی تیزی سے واپس آیا۔ مگر جہاں اس نے جوجی کو چھوڑا تھا وہ وہاں نہیں تھا بلکہ آس پاس کہیں بھی نہیں تھا۔ اس نے دبی زبان میں جوجی کو آواز دی اور جب کوئی جواب نہیں ملا تو شامی کی زبان سے بے شمار گفتنی نکل گئیں کہ جوجی عین موقع پر بزدل ثابت ہوا تھا اور اسے چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ وہ اس لیے آیا تھا کہ جوجی کو ان لوگوں کے پاس بھیجے اور انہیں یہاں بلوائے۔ ایک یا دو کے مقابلے میں چار افراد یقیناً زیادہ طاقتور ثابت ہوتے۔ شامی واپس ریسٹ ہاؤس کی طرف پلٹ رہا تھا کہ اس نے اسی خفیہ راستے سے دو افراد کو برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ مسلح تھے اور ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ خطرے سے نمٹنے کے لیے نکلے تھے۔ وہ نہایت چوکنا نظروں سے آس پاس دیکھ رہے تھے۔ شامی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اسے تلاش کر رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا یہاں نگرانی کے آلات بھی لگے تھے۔

ان میں سے ایک نے دوسرے کو عقب میں جانے کا اشارہ کیا اور خود اس طرف آیا جہاں شامی درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہاں درختوں کے تنے چوڑے تھے لیکن وہ نزدیک آنے پر اسے چھپا نہیں سکتے تھے۔ شامی نے سوچا اور ایک درخت کی دائیں بائیں نکلی شاخوں کی مدد سے اوپر چڑھنے لگا۔ شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے اور درختوں تلے تقریباً اندھیرا چھا گیا تھا اس لیے اسے امید تھی کہ وہ اوپر چڑھتا ہوا نظر نہیں آئے گا۔ ذرا سی دیر میں وہ زمین سے دس بارہ فٹ اونچی ایک بڑی شاخ تک پہنچنے میں کامیاب رہا اور اس پر اس طرح بیٹھ گیا کہ نیچے سے نظر نہ آئے۔ جب تک شامی درخت پر چڑھا، آنے والے کا دوسرا ساتھی ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے پیچھے چلا گیا تھا جہاں اب آگ اتنی پھیل گئی تھی کہ اس کی روشنی یہاں تک آرہی تھی۔ شامی کو اب اندر موجود نواب صاحب اور نوشی کی فکر بھی لاحق ہو گئی تھی۔

آنے والا کرنل سوین تھا۔ وہ نام نہاد کرنل تھا کیونکہ وہ کبھی فوج میں شامل نہیں رہا۔ اس کا تعلق ایک ایسی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی سے تھا جو دنیا کے کئی ممالک میں بے گناہ افراد کے قتل عام میں ملوث رہی تھی مگر اسے بین الاقوامی سطح پر کبھی دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ وہ بین الاقوامی سیکیورٹی بزنس کا بہت بڑا حصہ حاصل کر کے سالانہ اربوں ڈالرز کما رہی تھی۔ یہ ایجنسی جرائم پیشہ افراد اور نفسیاتی مریضوں کو بھرتی کر کے ان کو قتل و غارت گری کی ترتیب دیتی تھی اور پھر مغربی ممالک کے مخصوص مفادات کی حفاظت کے لیے ان کو ان علاقوں میں بھیجا جاتا جہاں مغرب کے مفادات ہوتے تھے۔ کرنل سوین مجرم آدمی تھا۔ اس ایجنسی میں آنے سے پہلے وہ تین سال کی جیل کاٹ چکا تھا کیونکہ اس نے ایک کمسن لڑکی کو زیادتی کے بعد شدید زخمی کر دیا تھا۔ وہ صرف اس لیے بچ گیا تھا کہ اس کے وکیل نے ثابت کیا تھا کہ اس فعل میں لڑکی کی مرضی بھی شامل تھی۔

درختوں کے پاس آتے ہوئے کرنل سوین کا انداز بہت محتاط تھا۔ اس نے گن سامنے کی ہوئی تھی اور سیکنڈ کے نوٹس پر فائر کھولنے کے لیے تیار تھا۔ شامی اسے نزدیک آتا دیکھ رہا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے پستول مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اصولاً شامی کو اسے موقع نہیں دینا چاہیے تھا مگر اس کا دل نہیں مانا کہ وہ ایک شخص کو بے خبری میں قتل کر دے۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ اس شخص نے اسے دیکھ لیا تو اسے بالکل موقع نہیں دے گا اور شوٹ کر دے گا۔ کرنل سوین نزدیک آیا اور اس نے اپنے ہیڈ سیٹ پر رائے سے پوچھا۔ ''کوئی نظر آیا؟''

''وہ اس طرف نہیں ہے۔'' رائے نے جواب دیا۔

''پیچھے کے درختوں میں دیکھو اور جیسے ہی دکھائی دے، اسے شوٹ کر دو۔''

شامی کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اسے فوت کرنے کا حکم دے رہا تھا اور اس کی بات سن کر شامی میں جو رہی سہی جھجک تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ اس بدبخت شخص کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا جو اسے قتل کرنے کے درپے تھا۔ وہ آگے آرہا تھا۔ اس کی محتاط نظریں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں، بس اسے اوپر کا خیال نہیں آرہا تھا۔ یہ خیال اسے بالکل آخری لمحے میں آیا۔ اس نے اوپر دیکھا اور شامی کو آتے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے رائفل اوپر کرنا چاہی مگر اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ شامی کے ہاتھ میں موجود پستول کا دستہ پوری قوت سے اس کے ماتھے پر لگا اور پھر شامی اس کے اوپر ہی گرا۔ اس نے سنبھل کر پھر وار کے لیے ہاتھ بلند کیا مگر اسے ساکت دیکھ کر رک گیا۔ ایک ہی وار کافی ہوا تھا اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

وار اتنا کاری تھا کہ ذرا سی دیر میں اس کا ماتھا سوج کر باہر نکل آیا تھا۔ شامی نے اس کی رائفل اٹھائی۔ یہ جدید ترین رائفل تھی۔ پھر اسے گھسیٹ کر درختوں میں اس طرح ڈال دیا کہ وہ فوری نظر نہ آئے۔ اس وقت بھی وہ جوجی کو سنا رہا تھا، وہ ہوتا تو وہ تیمور اور فولاد خان کو بلوا سکتا تھا۔ اس کامیابی کے بعد اس بات کے امکانات روشن ہو گئے تھے کہ وہ ان لوگوں پر قابو پا کر نواب صاحب اور نوشی کو چھڑوا لے گا۔ مگر اب بھی وہ اکیلا یہ سب نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ اسے جو کرنا تھا، خود کرنا تھا۔ پہلے سے نمٹ کر اب اسے دوسرے سے نمٹنا تھا مگر وہ اس جھنڈ سے باہر نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ اب اسے علم ہو گیا تھا کہ یہاں کیمرے لگے

ہوئے تھے۔ اس لیے وہ ریسٹ ہاؤس کے گرد پھیلنے والی آگ کے باوجود وہیں رک کر دوسرے کا انتظار کرنے پر مجبور تھا۔ اسے یقین تھا کہ جلد وہ یہاں آئے گا جب اسے اپنے ساتھی کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملے گا۔ شامی نے رائفل کو سنگل موڈ پر کرلیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آنے والے کو بنا وارننگ شوٹ کردے ورنہ وہ مشکل میں بھی پڑسکتا تھا۔

☆☆☆

نواب صاحب اور نوشی اس قید خانے کے باہر کے مناظر دیکھ سکتے تھے۔ کیونکہ تقریباً ساری دیواریں شیشے کی تھیں۔ اس بڑے سے ہال کو چاروں طرف سے اور چھت اور فرش کو بھی ایلومینیم فوائل نما کسی چیز سے ڈھکا گیا تھا۔ شاید اس کا مقصد یہاں موجود وائرس کو حادثاتی طور پر پھیلنے سے روکنا تھا۔ تین قطاروں میں شیشے اور دھات کے بنے کیبن تھے۔ کچھ کا شیشہ واضح تھا اور کچھ کا نیم شفاف شیشہ تھا جس کے دوسری طرف کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک طرف نیم شفاف پلاسٹک کا پردہ تھا اور اس کے دوسری طرف سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔ ان کے کیبن کا شیشہ شفاف تھا اور انہیں وہاں لوگ آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ ان میں اکثر غیر ملکی سفید فام تھے البتہ ایک لڑکی اور ایک ملازم نما مرد مقامی لگ رہے تھے۔ لڑکی جو شکل صورت کی خاص نہیں تھی مگر اس نے لباس بہت واہیات پہنا ہوا تھا جس میں اس کا جسم بہت نمایاں تھا۔ اس نے نوشی کو خاص طور سے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ نوشی پریشان تھی مگر نواب صاحب پرسکون تھے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ جگہ بھی کسی حیاتیاتی تجربہ گاہ جیسی ہے۔“

”یہ لوگ ہماری سرزمین پر بیٹھے ہیں اور ہماری حکومت کو علم ہی نہیں ہے۔“

”اس بے چاری کو تو اپنے لوگوں کے کارناموں کا پتا نہیں ہوتا ہے یہ تو پھر بھی غیر ملکی اور سپر پاور ہیں۔“

”آپ کے خیال میں یہ کون ہو سکتے ہیں؟“

”وہی جو اپنے طور پر دنیا کے ٹھیکے دار بنے ہوئے ہیں۔“ نواب صاحب کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آگئی۔ ”یہ وہ لوگ ہیں جو ترقی کا پہلا مصرف جنگ میں تلاش کرتے ہیں، چاہے وہ اسپرین کی ایجاد کیوں نہ ہو۔ یہاں یہ انسانوں کو جلد از جلد موت کے گھاٹ اتارنے کے طریقے تلاش کررہے ہوں گے۔“

”انکل! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”اللہ پر بھروسا رکھو میری بچی... وہ ہمارے لیے بہتر کرے گا۔“ نواب صاحب نے کہا۔ ان لوگوں نے ان کی تلاشی لی تھی اور تمام چیزیں اپنے قبضے میں کرلی تھیں مگر وہ نواب صاحب کے سینے پر بندھا ہوا چھوٹا سا باریک خنجر تلاش نہیں کرسکے تھے اور وہ سوچ رہے تھے کہ کیا ضرورت پڑنے پر وہ اس خنجر سے کام لے سکیں گے؟ وہ بوڑھے اور کمزور ہوگئے تھے جبکہ ان کے مدمقابل پوری طرح مسلح اور طاقتور تھے۔ پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر مرنے کا مرحلہ آیا تو وہ لڑکر مریں گے۔ خود کو آسانی سے موت کے حوالے نہیں کریں گے۔ نواب صاحب اور نوشی میز کے گرد بیٹھے تھے کہ اچانک ہی ہال میں افراتفری نظر آنے لگی اور پھر انہیں ہال میں بھرتا دھواں دکھائی دیا۔ وہ تشویش زدہ ہوگئے۔ کیا یہاں آگ لگ گئی تھی؟ مگر شعلے نظر نہیں آرہے تھے۔ اس کے کچھ دیر بعد ایک عجیب سا سائرن سنائی دینے لگا۔ نواب صاحب مضطرب ہوگئے۔

”یہ انتہائی خطرے کا سائرن ہے۔ یہاں کچھ ہوا ہے۔“

”کیا ہوا ہے؟ اور ہم تو یہاں قید ہیں۔“

نواب صاحب نے قید خانے میں رکھی دھاتی کرسی اٹھا کر شیشے پر ماری مگر وہ اس سے اچٹ کر آگئی اور شیشے پر خراش تک نہیں آئی۔ ”بلٹ پروف۔“ نواب صاحب نے زیرلب کہا اور کرسی رکھ دی۔ ”یہ قید خانہ ناقابلِ شکست ہے۔“

اسی لمحے باہر سے خودکار فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں اور پھر انہیں مقامی نقوش والا ملازم نما شخص وہاں موجود لوگوں پر گولیاں برساتا نظر آیا۔ اس کے پاس خودکار رائفل تھی اور وہ چن چن کر ایک ایک فرد کو مار رہا تھا اور جو چھپ رہے تھے ان کو تلاش کرکے قتل کررہا تھا۔ نواب صاحب اور نوشی حیران تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا یہ ان کا کوئی مددگار تھا؟ یا ان لوگوں کا آپس کا کوئی چکر تھا؟ پھر وہ شخص ایک طرف چلا گیا اور کچھ دیر بعد ایک برسٹ اور چلا اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ نوشی نے آہستہ سے کہا۔ ”انکل! یہ کیا ہورہا ہے؟“

”پتا نہیں میری بچی لیکن مجھے لگ رہا ہے جو ہورہا ہے ہمارے لیے اچھا ہورہا ہے۔“

مگر اسی لمحے ان کے کیبن کے ساتھ والے کیبن کی فائبر سے بنی دیوار پگھلنے لگی اور پھر اس سے شعلے اور دھواں اندر گھس آئے۔ یہ صورتِ حال بہت خوفناک تھی مگر وہ اس قید میں بے بس تھے، کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔

☆☆☆

تیمور نے ان تینوں سے جو ابتدائی پوچھ گچھ کی تھی اس سے اسے اندازہ ہوا کہ ان غیر ملکیوں نے یہاں ویرانے میں مقامی افراد پر کسی مہلک حیاتیاتی کیمیائی ہتھیار کے تجربات جاری رکھے ہوئے تھے اور وہ کم سے کم تین سال سے یہ کام کررہے تھے۔ فولاد خان سمجھ رہا تھا اور مشتعل تھا۔ اس نے ان تینوں کو ٹھوکریں ماریں۔ ”خنزیر کا بچہ... ام کو خوب صورت والا چوہا سمجھتا اے... ام تم کو کتے کا ماتق مارے گا۔“

تیمور کو اس صورتِ حال میں بھی ہنسی آئی۔ فولاد خان یقیناً گنی پگ کا حوالہ دے رہا تھا جو تجربہ گاہوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ فولاد خان اور تیمور نے جوجی کو داد دی۔ اس نے جرأت کا مظاہرہ کرکے فولاد خان کو بچالیا تھا۔ اگر وہ ایک لمحے کی دیر کرتا تو گولیاں فولاد خان کو لگتیں۔ جوجی نے انہیں ریسٹ ہاؤس کے بارے میں بتایا۔ ”میں ان دونوں کا پیچھا کرتا ہوا یہاں آیا ہوں۔ شامی بھائی وہیں ہیں اور پتا نہیں کیا کررہے ہیں۔“

تیمور نے فولاد خان اور جوجی سے کہا۔ ”ہمیں فوراً وہاں پہنچنا ہوگا، یہ دادا جان اور نوشی کو وہیں لے گئے ہیں۔“

جوجی نے تائید کی۔ ”شامی بھائی اکیلے ہیں اور مجھے غائب پاکر کوس رہے ہوں گے۔ ہمیں فوراً جانا ہوگا جی۔“

فولاد خان نے ان تینوں کو کھڑا کیا اور پھر ان کو ایک ہی رسی سے منسلک کردیا۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ جب تیمور نے انہیں چلنے کا حکم دیا تو انہوں نے احتجاج کیا کہ وہ اس حالت میں نہیں چل سکتے۔ اس پر فولاد خان نے ان پر پستول تان لیا۔ ”تیمور صیب! ان سے پوچھو یہ چلے گا یا ادر ای مرے گا۔“

تیمور نے انہیں آگاہ کیا کہ اگر انہوں نے حرکت نہیں کی تو یہیں مریں گے۔ یہ خان ان سے ویسے ہی خفا تھا اور انہیں جہنم رسید کرکے اسے دلی خوشی ہوگی۔ بادل ناخواستہ وہ حرکت میں آگئے۔ تیمور اور فولاد خان انہیں تیز چلنے پر مجبور کررہے تھے۔ انہیں دوسروں کی فکر تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سڑک تک پہنچے۔ یہاں ان کی گاڑیاں موجود تھیں۔ آدمی کی جلی لاش بھی تھی جو بالکل راکھ جیسی ہوگئی تھی اور صرف ہڈیاں بچی تھیں۔ جوجی اس سے دور سے گزرا تھا اور فولاد خان نے چند لمحے کے لیے رک کر اس کے لیے دعا کی تھی۔ پھر وہ اوپری ڈھلان کی طرف بڑھے۔ پونے سات کے قریب اندھیرا تیزی سے چھا رہا تھا۔ کچھ دیر میں وہ ریسٹ ہاؤس کے پاس پہنچ گئے اور تب انہیں اس طرف سے شعلے دکھائی دیے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں آگ لگ گئی تھی اور ان کی معلومات کے مطابق نواب صاحب اور نوشی اس عمارت کے اندر موجود تھے۔

☆☆☆

شعلے بہت تیزی سے ہال کے دوسرے حصوں میں پھیل رہے تھے اور اسی رفتار سے اندر دھواں بھی بھر رہا تھا مگر فی الحال نہیں۔ وہاں نہ تو کوئی زندہ انسان نظر آرہا تھا اور نہ ہی کوئی آواز آرہی تھی۔ سوائے ایک الارم کی آواز کے۔ نوشی نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر کیبن کی دیواریں ٹٹولنے لگی۔ نواب صاحب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کیبن کی عقبی دیوار اسی فائبر نما مادے کی تھی اور یہ ہاتھ لگانے پر دبیز پلاسٹک کا تاثر دیتا تھا۔ نوشی کو خیال آیا اور اس نے دھاتی کرسی اٹھا کر اس کے پائے تلے لگا پلاسٹک کا خول اتارا تو اندر سے گول دھاتی پائپ نکل آیا۔ نوشی نے اسے دیوار پر مارا تو وہ کسی قدر اندر دھنسا تھا۔ اس نے جوش سے کہا۔ ”انکل! ہم اسے توڑ سکتے ہیں۔“

”فائدہ... اس کے دوسری طرف بھی دیوار ہوگی۔“ نواب صاحب نے کہا تو نوشی نے برابر والے کیبن کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ دیکھیں، اس کی جل جانے والی دیوار کے پیچھے خلا ہے تو اس کے پیچھے بھی ہوگا... اور میں نے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس عمارت میں بہت سی کھڑکیاں ہیں جو ان دیواروں کے پیچھے ہوں گی۔ شاید ہم اس میں سے کسی کھڑکی سے نکل سکیں۔“

اس بار نواب صاحب قائل ہوگئے اور انہوں نے دوسری کرسی اٹھائی اور پھر وہ نوشی کے ساتھ شامل ہوگئے۔ انہوں نے ایک ہی جگہ طبع آزمائی کی اور کچھ دیر میں فائبر شیٹ پھٹنے لگی۔ اس کے پیچھے خلا تھا۔ اب وہ اس خلا کو اتنا بڑا کررہے تھے کہ اس سے باہر نکل سکیں۔ مگر اس خلا سے یہ نقصان ہوا کہ اب دھواں براہِ راست کیبن میں آرہا تھا۔ وہ سوراخ بڑا کرنے کے ساتھ کھانس بھی رہے تھے۔ پھر نواب صاحب نے نوشی کو پیچھے ہونے کو کہا اور اپنا پتلا خنجر نکال لیا۔ وہ اس سے شیٹ کاٹ رہے تھے۔ یہ کام بہت آسان ثابت ہوا تھا اور شیٹ تیزی سے کٹنے لگی۔ مگر اس وقت تک نصف ہال میں آگ نے اپنا تسلط قائم کرلیا تھا۔ پھر شیٹ اتنی کٹ گئی کہ اس سے ایک آدمی باہر نکل سکتا تھا۔ نوشی نے اپنا دوپٹا پھاڑ کر دو ٹکڑے کیے۔ ایک اپنے منہ پر باندھا تاکہ دھواں کم سے کم اندر جائے اور دوسرا نواب

صاحب کے منہ پر باندھ دیا۔ اب وہ خلا میں جانے کے لیے تیار تھے۔

پہلے نواب صاحب گئے اور پھر انہوں نے سہارا دے کر نوشی کو بھی اس خلا میں کرلیا۔ یہاں فائبر شیٹ اور ریسٹ ہاؤس کی دیوار کے درمیان دو ڈھائی فٹ کا خلا تھا مگر اس میں بے پناہ گرد، مکڑیوں کے جالے اور کاٹھ کباڑ بھی بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے اس طرف کا رخ کیا جہاں ابھی آگ نہیں پہنچی تھی مگر انہیں آگے بڑھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ یہاں ان تمام حشرات الارض اور چھوٹے جانداروں کی بہتات تھی جن سے خواتین کی جان جاتی ہے۔ نوشی بھی ایک خاتون تھی۔ اس لیے جب اس کے اردگرد ان نظر نہ آنے والوں جانداروں نے بھاگ دوڑ شروع کی تو اس کی جان پر بن آئی حالانکہ وہ بے چارے خود اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ نواب صاحب اس کی چیخوں پر تسلی دے رہے تھے کہ صرف چھپکلی ہے یا موٹا چوہا ہے جسے عرفِ عام میں گھوس کہتے ہیں۔ اس تسلی پر نوشی کی حالت مزید خراب ہورہی تھی۔

بالآخر وہ ایک کھڑکی کے سامنے پہنچے جس کے پٹوں میں کبھی شیشے لگے ہوں گے۔ مگر بعد میں ان کی جگہ لکڑی کے مضبوط تختے لگا دیے گئے تھے اور یہ تختے اندر کی طرف سے لگے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے پہلے طبع آزمائی کی اور پھر ان دونوں نے مل کر اپنا سارا زور لگایا مگر تختے بہت مضبوطی سے کھڑکی کی چوکھٹ میں لگے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”اسے توڑنا ہمارے بس سے باہر ہے۔“

وہاں دھواں بھر رہا تھا اور اب ان کی بچت کی ایک ہی صورت تھی کہ باہر سے مدد آئے۔ اس لیے نوشی نے مدد کے لیے چلانا شروع کردیا۔

☆☆☆

شامی بے چینی سے اس دوسرے آدمی کا انتظار کررہا تھا۔ ویسے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر اس خفیہ دروازے تک پہنچ جائے مگر اسے صبر سے انتظار کرنا تھا۔ جلد بازی نہ صرف اسے پھنسا دیتی بلکہ پھر نواب صاحب اور نوشی کا بچنا بھی ممکن نہ رہتا۔ یہی شخص اسے اندر لے جاسکتا تھا۔ رائے چند منٹ بعد عقبی سمت سے نمودار ہوا اور وہ ہیڈسیٹ پر ہاتھ رکھے ہوئے کرنل سوین کو پکار رہا تھا۔ مگر کرنل سوین دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ جب رائے کو کرنل کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ چوکنا ہوگیا اور اس نے رائفل تان لی۔ شامی نے اس کے انداز سے محسوس کیا کہ اسے قابو میں کرنا اب آسان نہیں ہوگا۔ اس لیے اس نے رائفل استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور نشانہ لے کر گولی چلادی۔ گولی نشانے پر لگی اور رائے چیخ مار کر نیچے گرا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی تھی مگر وہ بیلٹ کی وجہ سے اس کے جسم سے لگی رہی۔ گولی اس کے پاؤں میں لگی تھی اور وہ اسے پکڑ کر کراہ رہا تھا۔ شامی نے للکار کر کہا۔

”رائفل پھینک دو ورنہ دوسری گولی سر میں اترے گی۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی اور رائفل دور پھینک دی۔ پھر وہ شامی کے حکم پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ شامی محتاط قدموں سے اس کی طرف بڑھا لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ رائے نے ایک چھوٹا سا پستول نکال لیا تھا اور اس کے نزدیک آنے کا انتظار کررہا تھا۔

☆☆☆

تیمور اور فولاد خان فائر کی آواز پر چونکے اور جوجی کا رنگ سفید پڑ گیا کیونکہ وہ نیم تاریکی میں مزید صاف نظر آنے لگا تھا۔ تیمور فکرمند ہوگیا۔ اس نے فولاد خان سے کہا۔

”یہ رائفل کا فائر ہے۔ شامی کے پاس کولٹ ہے۔ تم ان لوگوں کی نگرانی کرو اور اگر کوئی گڑبڑ کرے تو بے دریغ اس کا سر اڑا دینا۔“

تیمور تیزی سے درختوں میں آگے بڑھا اور کچھ دیر بعد وہ اس طرف نکلا جہاں شامی نے رائے کو قابو کیا ہوا تھا اور اس کی طرف بڑھ رہا تھا مگر وہ اس کے ہاتھ میں دبے چھوٹے پستول سے بے خبر تھا۔ تیمور نے پستول دیکھ لیا۔ اس نے چلا کر شامی کو خبردار کیا۔ اس کے ساتھ ہی رائے نے کروٹ لیتے ہوئے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا۔ تیمور نے عجلت میں فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی رائے کے پستول سے بھی فائر ہوا۔ تیمور کی چلائی ہوئی گولی رائے کے شانے میں اتر گئی اور اس کی چلائی گولی نہ جانے کہاں گئی تھی۔ شامی بالکل ساکت کھڑا تھا۔ تیمور نے ڈرتے ڈرتے شامی کے پاس جاکر اسے ہلایا تو وہ چونکا۔

”شکر ہے تو نے بروقت فائر کیا۔“

”تو کہاں گم ہوگیا تھا؟“

”یار! مجھے لگا جیسے نوشی کے چلانے کی آواز آرہی ہے، وہ مجھے پکار رہی ہے۔“

تیمور نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”ذرا سی دیر کی جدائی میں تیرا یہ حال ہوگیا ہے۔ پھر اس سے بھاگتا کیوں ہے؟“

شامی بھنا گیا۔ ”تجھے شاعری کی سوجھ رہی ہے، میں مصیبت کی بات کررہا ہوں۔“

”بھائی ہر عورت مصیبت ہوتی ہے کسی نہ کسی کے لیے۔“ تیمور نے کہا اور اچھل پڑا کیونکہ اب اسے بھی آواز آئی تھی۔ وہ اور شامی ریسٹ ہاؤس کی طرف بھاگے اور قریب پہنچنے پر انہیں کھڑکیوں کے رخنوں سے نکلنے والا گاڑھا دھواں نظر آیا۔ شامی فکرمند ہوگیا۔

”آگ اندر تک پہنچ گئی۔“

”آگ؟“ تیمور چونکا۔ ”وہ کیسے لگی؟“

”میں نے لگائی تھی۔“ شامی نے فخر سے کہا اور چلا کر بولا۔ ”نوشی... دادا حضور۔“

”وہ لوگ اندر ہیں اور تُو نے آگ لگادی؟“ تیمور بھی چلایا۔

”شامی... تیمور۔“ انہیں نوشی کی آواز آئی اور مزے کی بات ہے یہ آواز انہیں کونے والی کھڑکی سے آرہی تھی جس کے شیشے کب کے ٹوٹ گئے تھے اور اس پر اندر سے تختے جڑے ہوئے تھے۔ شامی اور تیمور اس طرف بھاگے۔ شامی نوشی کو پکار رہا تھا۔ چند لمحے بعد کھڑکی کے پیچھے سے نوشی نے تصدیق کی۔ ”ہم اس کے پیچھے ہیں... جلدی کھولو۔ یہاں دھواں بھر رہا ہے اور آگ بھی لگی ہوئی ہے۔ ہماری حالت خراب ہورہی ہے۔“

”پیچھے ہٹو۔“ شامی نے کھڑکی کی تقریباً دو فٹ چوڑی چوکھٹ پر چڑھتے ہوئے کہا۔ اس نے دونوں ہاتھ دائیں بائیں لگائے اور تختوں پر لاتیں مارنے لگا۔ یہ اندر سے لگے تھے اس لیے اندر کی طرف ہی ٹوٹ سکتے تھے۔ کوئی ایک درجن لاتیں کھانے کے بعد تختے جواب دے گئے اور بالآخر کھڑکی سمیت اندر جا گرے۔ فوراً ہی اندر سے نواب صاحب اور نوشی نمودار ہوئے۔ پہلے نوشی نے نواب صاحب کو سہارا دے کر کھڑکی پر چڑھایا اور پھر شامی کا ہاتھ نظرانداز کرکے خود اچک کر چڑھی اور باہر آگئی۔ وہ دونوں گرد، مٹی اور مکڑیوں کے جالوں میں اٹے ہوئے تھے۔ کھڑکی ٹوٹتے ہی اندر سے گہرا دھواں نکلنے لگا۔ جبکہ اندر شعلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ اب وہ کھڑکیاں اور دروازے جلانے لگے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اندر کسی کا بچنا ممکن نہیں تھا۔ وہ سب عمارت سے دور چلے گئے۔ جوجی کو دیکھ کر شامی جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا تھا کہ وہ بھاگ کر تیمور کے پیچھے ہوگیا اور چلایا۔ ”تیمور بھائی، انہیں بتائیں کہ کیوں آپ کی طرف گیا تھا۔“

”یہ بھگوڑا ہے۔“

”جوجی صیب دلیر آدمی اے۔“ فولاد خان نے اس

افسوس

دو آدمی اُجرت پر خط لکھنے کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے دونوں ہی اتنے بدخط تھے کہ اپنا لکھا خود ہی پڑھ سکتے تھے۔ ایک دن دونوں کی سرِراہ ملاقات ہوگئی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ ”کہو بھائی! کیسی کٹ رہی ہے؟“

دوسرے نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔ ”بڑی اچھی گزر رہی ہے۔ چونکہ میرا لکھا کوئی اور نہیں پڑھ سکتا اس لیے خط پڑھنے کے لیے بھی مجھ ہی کو جانا پڑتا ہے جس سے مجھے اجرت دگنی مل جاتی ہے۔“

پہلے نے ٹھنڈی سانس بھری۔ دوسرے نے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ تم نے سرد آہ کیوں بھری؟“

پہلے نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں اب اس نوبت کو پہنچ چکا ہوں کہ اپنا لکھا خود بھی نہیں پڑھ سکتا، چنانچہ میں بدقسمتی سے اس دوسری اُجرت سے محروم ہوگیا ہوں۔“

حبُ الوطن

نواب مشتاق احمد خان ایجنٹ جنرل حیدرآباد دکن کا بیان ہے کہ ایک بڑھیا اپنی گٹھری لیے ہوئے بڑی مشکل سے ان کے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں داخل ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹکٹ چیکر نے آکر سب کے ٹکٹ دیکھے۔

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دن تھے۔ ان دنوں اول درجے اور تیسرے درجے میں کوئی تمیز باقی نہیں رہی تھی لیکن بلاٹکٹ سفر کرنے پر ضرور پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ بڑھیا کی باری آئی تو اس نے ٹکٹ چیکر سے التجا کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! میں اپنا سب کچھ کھو کر آئی ہوں۔ میری کل کائنات یہی گٹھری ہے۔ مجھ پر رحم کرو۔“

نواب صاحب خود ایک ریلوے افسر رہ چکے تھے۔ وہ خاموشی سے مشاہدہ کرتے رہے کہ دیکھیں چیکر کیا کرتا ہے؟ چیکر نے جو کچھ کیا عام حالات میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس نے اپنی کاپی سے رسید کاٹی اور رندھی ہوئی آواز میں بڑھیا کو جواب دیا۔

”اماں! مجھے معلوم ہے کہ تم کتنی مظلوم ہو۔ تم ہی بتاؤ کہ ٹکٹ کے بغیر ریل میں سفر کرنے سے پاکستان کیسے چلے گا؟ جس کے لیے تم نے اور میں نے بڑی قربانیاں دی ہیں اس لیے رسید تو بنے گی تاکہ ملک کا نقصان نہ ہو۔ البتہ اس کی رقم میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔“

مرسلہ: عبدالغفار کوثر، اورنگی کراچی

کی حمایت کی۔ ”اس نے امارا جان بچایا۔“

تیمور نے تفصیل سے بتایا کہ جوجی کس طرح ان دو افراد کے پیچھے آیا اور اس نے بروقت کارروائی کر کے فولاد خان کی جان بچائی تھی۔ اس پر شامی نے بادل ناخواستہ اسے معاف کیا۔ نوشی اور نواب صاحب کی سانس بحال ہوئی تو انہوں نے اندر کا حال بتایا۔ تیمور اور شامی سن کر حیران رہ گئے۔ تیمور نے کہا۔ ”یہ تو اللہ کی مدد ہوئی کہ اندر والے خود لڑ مرے۔ یہاں بھی ہم نے چھ بندے پکڑ لیے ہیں۔“

نواب صاحب چونکے۔ ”زندہ؟“

”ہاں، کوئی اتنا غیرت مند تھا کہ پاؤں پر گولی اور سر پر ضرب کھا کر مرجاتا۔“ تیمور نے کہا تو شامی آہستہ سے بولا۔

”دادا حضور! یہ سب غیر ملکی ہیں۔“

انہوں نے سر ہلایا۔ وہ سب درختوں کے پاس آئے۔ فولاد خان نے سب کو ایک جگہ جمع کر لیا تھا اور ان کی ایک بار پھر تلاشی لی تھی۔ وہ سب کرنل سوین سمیت ایک قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تیمور نے فولاد خان کو روانہ کیا کہ وہ جا کر گاڑی سے پانی اور نواب صاحب کی دوائیں لے آئے کیونکہ ان کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ کرنل سوین انہیں دھمکیاں دے رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ ان کا تعلق ایک بین الاقوامی آرگنائزیشن سے ہے۔ اگر انہیں کچھ ہوا تو ان کے ملک کے لیے مسئلہ ہو جائے گا۔ شامی اور تیمور انہیں سنانا چاہتے تھے مگر نواب صاحب نے انہیں ان کے منہ لگنے سے روک دیا۔ ”کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ شرمندہ ہونے والے لوگ نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں اپنے جرائم کا احساس ہے۔“

”ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔“ کرنل سوین اردو میں بولا۔

”خوب... تمہیں ہماری زبان بھی آتی ہے۔“ شامی نے کہا۔ ”یہاں جو انسانوں پر تجربات ہو رہے تھے ان کے بارے میں کیا کہو گے؟“

”ان تجربات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”ہم یہاں صرف سیکیورٹی فراہم کر رہے ہیں۔“

فولاد خان پندرہ منٹ میں ٹارچ سمیت یہ چیزیں لے آیا تھا۔ اس وقت تک ریسٹ ہاؤس کی عمارت مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی اور اس کی پرانی کھپریل کی چھت بھی جل کر اندر اور باہر گر رہی تھی۔ مگر یہ جگہ ایسی تھی کہ چاروں طرف بہت دور سے یہ آگ نظر نہیں آتی۔ وہ مطمئن تھے کہ آس پاس کا جنگل اس سے محفوظ تھا اور یہاں ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے حفظِ ماتقدم ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف سے ایسا ملبا ہٹا دیا جو آگ کو درختوں تک لا سکتا تھا۔ پانی اور دوائیں لے کر نواب صاحب کی حالت بہتر ہوئی اور انہوں نے ان چھ افراد سے پوچھ گچھ کی۔ بہت کچھ ان کو پہلے ہی معلوم تھا۔ باقی ان لوگوں نے بتایا اور یہ خاصی سنگین صورتِ حال تھی۔ وہ کسی بات کا اقرار کرنے سے نہیں جھجک رہے تھے اور انہیں اس کا خوف بھی نہیں تھا کہ انہیں یہاں قانون کے حوالے کر دیا جائے گا۔ نواب صاحب شامی، تیمور اور نوشی کو ایک طرف لے گئے۔

”ایسا لگ رہا ہے ان لوگوں کو کوئی چھتری حاصل ہے۔“

”مقامی؟“ شامی نے پوچھا۔

”نہیں، ہمارا اندازہ ہے یہ کوئی بین الاقوامی معاملہ ہے۔“

”وہ تو بالکل صاف ہے دادا جان۔“ تیمور نے کہا۔

”اب سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کا کیا کرنا ہے؟“

نواب صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ شامی اور تیمور پیچھے ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب نواب صاحب اس طرح سوچتے تھے تو وہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ تاریکی مکمل طور پر چھا چکی تھی۔ نوشی اپنے ٹخنے کا معائنہ کر رہی تھی۔ نواب صاحب کی دواؤں کی کٹ میں سوجن کے لیے ایک موثر لگانے والی دوا تھی، اسے لگانے سے ٹخنے کی سوجن کم ہوئی اور اب اسے پاؤں رکھتے ہوئے تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ایک پین کلر بھی لی تھی۔ پینے کے بعد بچ جانے والے پانی سے اس نے ممکنہ حد تک خود کو صاف کر لیا۔ اس حالت میں بھی اسے یہ فکر زیادہ تھی کہ وہ بدہیت تو نہیں لگ رہی تھی۔ شامی اس کے پاس آیا۔

”پاؤں میں کیا ہوا؟“

”موچ آئی ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

شامی نے سادگی سے پوچھا۔ ”منہ میں آئی ہے؟“

”تم بات مت کرو مجھ سے۔“ وہ غرائی۔ ”آوازیں دے دے کر میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔“

”کہاں بیٹھا ابھی تک عمدگی سے کام کر رہا ہے۔“ شامی بولا۔ ”تبھی تو مجھ پر غرا رہی ہو۔“

”تمہیں میری قطعی فکر نہیں ہے۔“ نوشی نے الزام لگایا۔

”تبھی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہاں چلا آیا۔“ شامی کا

موڈ خراب ہو گیا۔

"وہ تم نواب انکل کی وجہ سے آئے تھے۔" نوشی نے کہا تو شامی کا موڈ مزید خراب ہو گیا اور وہ اٹھ کر تیمور کے پاس آیا جو فولاد خان سے پوچھ رہا تھا کہ ان لوگوں سے چھٹکارے کا کوئی قبائلی طریقہ ہے۔ اس پر فولاد خان نے کہا۔

"بالکل اے تیمور صیب... پر وہ ام آپ کو بتا نہیں سکتا۔"

"کیوں؟"

"خوفیہ اے۔" فولاد خان نے قطعی سنجیدگی سے کہا۔ "ام آپ کو نہیں بتا سکتا۔ اگر بتا دیا تو ام بادمیں خود بھی مارا جا سکتا اے۔"

شامی اسے یقین دلانا چاہ رہا تھا کہ وہ انہیں بتا دے تو ہرگز کسی کو نہیں بتائیں گے مگر اسی دوران میں نواب صاحب نے انہیں آواز دی۔ "برخوردارو! تشریف لائیے۔"

وہ دونوں نواب صاحب کے سامنے باادب حاضر ہوئے۔ "جی دادا جان۔"

نواب صاحب نے حکم صادر فرمایا۔ "تم دونوں نوشی اور جوجی کو لے کر روانہ ہو جاؤ۔ اب واپس جانا اور اسی راستے سے گزرنا۔ ہمارا اندازہ ہے سڑک کھل گئی ہوگی۔"

"اور آپ؟"

"ہم واپس جائیں گے اس مسئلے کو حل کر کے۔" انہوں نے چھ گرفتار شدگان کی طرف اشارہ کیا۔ "جو آدمی باہر آئے اور تمہارے ہاتھ لگے، ان کا سامان کہاں ہے؟"

تیمور نے بتایا کہ انہوں نے ان تینوں کا سامان کہاں چھوڑا تھا۔ نواب صاحب نے اس کے ساتھ شامی اور جوجی کو روانہ کیا۔ انہوں نے وارننگ دی تھی کہ ایک چیز بھی کم نہ ہو۔ اگر انہیں شبہ ہو کہ کوئی چیز کم ہے تو آس پاس تلاش کریں۔ خاص طور سے انہوں نے نواب صاحب اور نوشی کی تلاشی لے کر جو سامان قبضے میں کیا تھا، اسے لازمی تلاش کیا جائے۔ ایک گھنٹے میں انہوں نے تمام سامان جمع کر لیا۔ اس میں کارل کے پاس سے برآمد ہونے والا نواب صاحب اور نوشی کا سامان بھی تھا۔ اسے پا کر نواب صاحب نے سکون کا سانس لیا۔ وہ یہاں ایسی کوئی چیز چھوڑنا نہیں چاہتے تھے جو بعد میں ان کی نشان دہی کرے۔ انہوں نے تیمور اور شامی سے کہا۔ "اب تم لوگ جاؤ اور بالکل نارمل رہنا۔ کسی سے رابطے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل صبح دس بجے کے بعد ہمیں کال کرنا۔"

اس کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اگرچہ شامی اور تیمور آمادہ نہیں تھے، وہ فکر مند تھے مگر نواب صاحب نے جب انہیں مخصوص انداز میں حکم دیا تو انہیں جانا ہی پڑا۔ وہ روانہ ہوئے اور واپس ہائی وے پر پہنچے۔ نواب صاحب کا کہنا درست ثابت ہوا تھا کہ سڑک کھل گئی تھی اور اس پر ٹریفک رواں تھا۔ وہ سب متجسس تھے کہ نواب صاحب ان چھ گرفتار شدگان کا کیا کریں گے۔ تیمور نے کہا۔ "میرا خیال ہے دادا جان انہیں کسی ایجنسی کے حوالے کریں گے جو اس قسم کے معاملات دیکھتی ہے۔ وہ غیر ملکی ہیں۔"

شامی اس سے اختلاف کرنا چاہتا تھا مگر ڈرائیونگ کرتے تیمور نے اسے آنکھ سے اشارہ کیا تو وہ چپ ہو گیا۔ تھکن اور شاک سے بے حال نوشی اور جوجی پیچھے خاموش بیٹھے تھے۔ وہ رات تقریباً ایک بجے ریسورٹس پہنچے تو سب کا تھکن سے برا حال تھا۔ ان کے لیے کمرے بک تھے، اس میں سے انہوں نے نواب صاحب والا کمرا کینسل کرا دیا کیونکہ وہ واپس جاتے۔ اپنی مرسیڈیز کی باڈی پر گولیوں کے نشانات کے ساتھ وہ یہاں کیسے آسکتے تھے۔ شامی پہلے اداس تھا مگر اب خوش تھا کہ اب نواب صاحب نہیں تھے۔ ہوٹل کے ڈائننگ روم میں بچا کھچا ڈنر کرتے ہوئے وہ چہک رہا تھا۔ کمرے میں آنے کے بعد تیمور نے اسے یاد دلایا کہ نوشی تھی دادا جان کے قائم مقام کے طور پر۔ مگر نواب صاحب کے نہ ہونے سے اب شامی نوشی سے ڈرنے پر بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے دلیری سے کہا۔

"مجھے نوشی کی ذرا پروا نہیں ہے۔"

بدقسمتی سے اسی وقت دروازہ کھلا اور اندر آتی نوشی نے اس کا جملہ سن لیا۔ وہ پھٹ پڑی۔ "مجھے پہلے ہی پتا تھا، تمہیں میری کوئی پروا نہیں ہے۔ میں ہی پاگل ہوں جو تمہارے پیچھے لگی رہتی ہوں۔"

شامی بوکھلا گیا۔ "اف، تم نے غلط سنا ہے۔"

"غلط سنا ہے۔" نوشی نے چبا کر کہا اور پھر شامی کا جملہ لفظ بہ لفظ دہرایا بالکل اسی کے لہجے میں۔

"میرا مطلب ہے تم نے غلط سمجھا ہے۔"

"نہیں میں پہلے غلط سمجھتی تھی اب میری ساری غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔ میں کل صبح یہاں سے واپس جا رہی ہوں۔" نوشی جھٹکے سے مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔ شامی اس کے پیچھے لپکا۔

"نوشی یار! میری بات تو سنو... خدا کی قسم میرا یہ مطلب نہیں تھا... اف رکو تو کیا ہوٹل والوں کو تماشا دکھاؤ گی۔"

تیمور اپنے بیڈ پر دراز ہو کر مسکرانے اور گنگنانے لگا۔

اسے معلوم تھا کہ شامی نوشی کو منا لے گا۔ وہ اس کام میں ماہر تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کل ہی ان کا پھر آپس میں جھگڑا ہو رہا ہو گا۔ اس کا اندازہ درست نکلا جب شامی ایک گھنٹے بعد مسکراتا ہوا واپس آیا۔ تیمور نے غور سے اسے دیکھا۔ "یہ تیرا دایاں گال بائیں کے مقابلے میں زیادہ سرخ کیوں ہو رہا ہے؟"

"شاید چوٹ لگی ہو گی۔" شامی نے بے دھیانی میں ہاتھ پھیرا اور پھر گھور کر تیمور کو دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم دو دن یہاں رکیں گے اور پھر کم سے کم دو ہفتے کے ٹریک پر جائیں گے۔"

"میں بھی نوشی سے یہی کہہ رہا تھا۔" شامی نے سر ہلایا۔ "اسی بات پر تو وہ مانی ہے۔"

تیمور اچھل پڑا۔ "اب وہ ہمارے ساتھ جائے گی؟"

"بالکل! جوجی بھی جائے گا۔"

"اور وہ جو تیرا غیر ملکی خواتین سے میل ملاقات کا پروگرام تھا؟"

"اس بار تو مل لینا۔"

"شامی نے کہا اس سال نہ سہی اگلے سال سہی۔"

"بیٹے، یہ تیری جان نہیں چھوڑے گی۔" تیمور نے کہا۔

"جان چھڑانا بھی کون چاہتا ہے۔" شامی بستر پر گرا۔ کھا پی کر اور گرم پانی سے غسل کر کے تھکن تو اتر گئی تھی مگر اب نیند کا خمار چڑھ رہا تھا۔ "مگر یار! یہ جو ابھی سے بیوی بنتی ہے نا اس سے غصہ آتا ہے۔"

اگلے دن انہوں نے سب سے پہلے نواب صاحب کو کال کی اور یہ جان کر سکون کا سانس لیا کہ وہ مع فولاد خان واپس پیلس پہنچ گئے تھے اور ان کی مرسیڈیز فوری مرمت کے لیے مخصوص ورکشاپ جا چکی تھی۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے ان چھ گوروں کا کیا کیا تھا۔ صرف اتنا کہا کہ مسئلہ حل ہو گیا ہے اور یہ کہہ کر انہوں نے کال کاٹ دی۔ یہاں موبائل سگنل نہیں تھے اور وہ ایک لینڈ لائن فون سے بات کر رہے تھے۔ شامی ریسیور تھامے رہ گیا اور تیمور اس کے کان سے کان لگائے ہوئے تھا۔ وہ بھی متجسس تھا کہ نواب صاحب نے ان چھ مصیبتوں کا کیا کیا ہو گا۔ اس دن وہ یہیں ریسورٹس کے آس پاس گھومتے رہے۔ میگزین کی اسٹوری سچ ثابت ہوئی تھی۔ وہاں درجنوں کے حساب سے غیر ملکی خواتین آئی ہوئی تھیں اور ان میں اکثریت مغربی ممالک سے تعلق رکھنے والی خواتین کی تھی۔

تیمور بہت خوش تھا کیونکہ اس نے ایک سوئس خاتون سیاح کو اپنے ہمراہ ٹریک پر چلنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ وہ ایک بیک پیک اٹھا کر اکیلی ہی ہمالیہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی سیر کے لیے نکل آئی تھی۔ جوجی نے اس کا نام سوئس مس رکھا اور سب اسے یہی کہنے لگے۔ وہ بھی اس نام پر خوش تھی۔ اگلے دن انہوں نے ٹریک کے لیے کچھ سامان لیا۔ اکثر سامان جیسے خیمے، خاص کپڑے، جوتے اور ہائکنگ کے لیے درکار اشیا وہ ساتھ لائے تھے۔ اسی طرح ڈبا بند خوراک بھی ساتھ لائے تھے۔ یہاں سے انہوں نے اپنے لیے دو عدد پورٹرز کا بندوبست کیا جو ان کا سامان اٹھاتے اور منزل پر پہنچ کر ان کے لیے خیمے لگاتے اور کھانا وغیرہ بناتے۔ وہ خود ساری ذمے داریوں سے آزاد ہو کر صحیح معنوں میں اس سفر سے لطف اٹھاتے۔ سوئس خاتون حیران تھی۔ اس نے ان سے کہا۔

"ہمارے ہاں تو سب ٹریک پر اپنا سارا کام خود کرتے ہیں۔ وہاں پورٹرز رکھنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔"

شامی نے کہا۔ "ہم پاکستانی نواب ہوتے ہیں۔ کچھ پیدائشی ہوتے ہیں اور باقی بعد میں بن جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو فقیر بھی نوکر رکھتے ہیں۔"

سوئس مس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "فقیر بھی... میں نے کبھی ایسا نہیں سنا۔"

"ہمارے ہاں مانگنا نفع بخش پیشہ ہے۔ ایک فقیر آسانی سے دو تین نوکروں کا خرچ برداشت کر سکتا ہے۔"

"تب تم کیا ہو؟" سوئس مس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

"بیڑا غرق۔" ذرا دور بیٹھے تیمور نے کہا۔ "اب تو اپنی نوابی جتائے گا تب بھی یہ یقین نہیں کرے گی۔"

ایسا ہی ہوا۔ اس پورے سفر کے دوران میں اس نے یہی خیال کیا کہ وہ لوگ بھی فقیر تھے۔ تیمور شامی کو برا بھلا کہتا رہا جس نے اس کا سارا چانس غارت کر دیا تھا۔ مگر نوشی اور شامی نے پہلی بار کسی کام کو مل کر انجوائے کیا اور جوجی ان کی خوشی میں خوش تھا۔ مگر اسے درمیان سے واپس جانا پڑا تھا کیونکہ اس کے باپ کی جانب سے طلبی آگئی تھی اور دو خوفناک قسم کے مشٹنڈے جوجی کو عین ٹریک کے درمیان سے تقریباً اٹھا کر لے گئے تھے۔ دو ہفتے کے ٹریک نے انہیں تھکا دیا تھا۔ سوئس خاتون نے آگے جانا تھا اس لیے وہ اس کے ساتھ چند دن کے لیے اسکردو میں رک گئے اور جب وہ چلی گئی تو انہوں نے بھی واپسی کا سفر شروع کیا۔ ایک کرائے کی جیپ نے انہیں اسی ریسورٹس میں چھوڑا جہاں ان کی لینڈ کروزر موجود تھی اور وہ اس پر واپس آئے۔ اس سفر کے سنسنی خیز آغاز سے قطع نظر وہ سفر کے اختتام پر

افسردہ تھے۔ نوشی نے شامی سے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے تم واپس جاتے ہی پھر مجھ سے بھاگے بھاگے پھرو گے اس لیے میری خواہش ہے کہ ہم واپس ہی نہ جائیں۔“

”تاکہ گردیزی صاحب ہمارے خلاف اغوا کا پرچہ کٹوا دیں۔“

”اس کے لیے پاپا کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اب تم مجھ سے بھاگے تو میں ہی یہ کام کر جاؤں گی۔“

وہ دونوں اکیلے تھے، شامی نے کہا۔ ”شکر ہے وہ میرا نہ ہونے والا سالا نہیں ہے ورنہ وہ پہلے سے میرے خلاف وعدہ معاف گواہ بن جاتا۔“

واپسی پر انہوں نے موسم اور نواب صاحب کو پُرسکون اور سرد پایا۔ موسم تو بارشوں کی وجہ سے اچھا تھا مگر نواب صاحب کا خوشگوار موڈ سمجھ سے باہر تھا۔ شامی کو یقینِ واثق تھا کہ واپسی میں یہ واقعہ بھی ان کے کھاتے میں ڈال کر دادا جان کم سے کم ایک مہینا ان کی زندگی عذاب میں رکھیں گے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ نواب صاحب کے خوشگوار موڈ کے باوجود شامی اور تیمور پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکے تھے کہ انہوں نے ان چھ افراد کا کیا کیا؟ البتہ نوشی اور جوجی کو یہی بتایا تھا کہ ان چھ افراد کو خفیہ ایجنسی کے سپرد کر دیا ہے اور ان کے بارے میں سختی سے زبان بند رکھنے کا حکم ملا ہے۔ اس ریسٹ ہاؤس کے جلنے یا وہاں سے لاشیں ملنے کے بارے میں اخبارات یا میڈیا میں کچھ نہیں آیا تھا۔ اگر یہ معاملہ حکامِ بالا کے علم میں آیا بھی تھا تو اسے عوام کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ وہ لوگ مطمئن تھے کہ وہاں لگنے والی خوفناک آگ نے اس حیاتیاتی کیمیائی ہتھیار کو بھی ختم کر دیا ہوگا۔

شامی کو زمین اور فصل کے بعض معاملات کے سلسلے میں چن پور بلایا گیا۔ زندگی میں پہلی بار وہ چن پور سے خوش خوش واپس آیا تھا ورنہ روتے ہوئے جاتا تھا اور روتے ہوئے واپس آتا۔ اس بار والد بزرگوار نوابزادہ عامر نے اسے جاگیر کی آمدنی سے حصہ دینا شروع کر دیا تھا کیونکہ اب وہ تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ ملنے والے حصے سے شامی نے تیمور، نوشی اور جوجی کو ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں پارٹی دی اور پھر بچ جانے والی رقم سے فولاد خان کا قرض مع سود ادا کیا۔ وہ پہلے خوش ہوا اور پھر اداس ہو گیا۔ شامی نے وجہ پوچھی تو بولا۔ ”شامی صیب خدا کا قسم اے، ام آپ کو قرض کاروبار کے لیے نہیں دیتا۔ یہ تو آپ سے موحابت کا تعلق اے۔ خدا کرے آپ کو جلد قرض کا ضرورت پڑے اور آپ ام سے رجوع فرمائے۔“

شامی نے اعتراض کیا۔ ”یہ کیسی محبت ہے جس میں تم سود کا پورا حساب لگاتے ہو... سود پر بھی سود وصول کرتے ہو۔“

اس پر فولاد خان نے چالاکی سے کہا۔ ”شامی صیب موحابت اپنی جاگا اور سود اپنی جاگا۔“

”ٹھیک کہا تم نے۔“ شامی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”پہلے محبت آدم خور ہوتی تھی پھر رشوت خور ہوئی اور اب سود خور بھی ہو گئی ہے۔“

فولاد خان نے دانت نکالے۔ ”ام جائل آدمی اے، ام کو یہ بوت پڑا لکا بات سمجھ نہیں آتا۔“

”فولاد خان تم بہت ہوشیار ہو گئے ہو، اب ہم سے بھی باتیں چھپانے لگے ہو۔“ شامی نے شکوہ کیا۔

”کون سا بات؟“ اس نے انجان بن کر پوچھا۔

”یہی کہ ان چھ گوروں کا کیا کیا؟“

”ام بتا دیتا پر نواب صیب نے منا فرمایا اے۔ ام مر سکتا اے پر نواب صیب سے نافرمانی نہیں کر سکتا۔“

”اچھا چلو تم یہ بتاؤ کہ ایسے چھ بندے تمہارے ہاتھ لگتے تو تم ان سے کیسے نمٹتے؟ ان کے ساتھ کیا کرتے؟“

”ام ان کو قبائلی طریقے سے ٹھکانے لگاتا۔“

”اور وہ قبائلی طریقہ کیا ہوتا؟“

فولاد خان نے پہلے سر اور پھر گردن کھجائی اور بولا۔ ”ادر امارا قبیلہ میں رواج اے اگر ایسا دشمن مل جائے جسے خود نہ مارنا او تو ادر زمین میں گڑا کر کے ان کو ڈال کر اوپر سے پتھر مٹی ڈال دیتا اے۔“

شامی دم بہ خود رہ گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ زندہ دفن کر دیتے ہیں؟“

”بالکل... پھر وہ دفن او کر مرتا اے۔ امارے اوپر خون نہیں آتا۔“

”لیکن اگر وہ گڑھے سے نکل آئے یا ان کے لوگوں کو پتا چل جائے؟“

”کیسے پتا چلے گا؟ ام بوت گہرا گڑا کودتا اے اور فیر اس پر خاردار خارش والا پودا لگاتا اے، جانور بھی پاس نہیں جاتا۔ چھوے تو خارش ہو جاتا اے۔ کتا بی دور رہتا اے۔“

شامی سوچ رہا تھا کہ یہ کتنا خوفناک طریقہ ہے۔ کسی انسان کے لیے اس سے زیادہ اذیت ناک موت کیا ہوگی کہ اسے زندہ دفن کر دیا جائے۔ مگر اس دنیا میں بہت سے لوگ اس سے بھی زیادہ سخت سزا کے قابل ہوتے ہیں کیونکہ وہ انسانیت کے مجرم ہوتے ہیں۔